کیفی اعظمی

فکر و فن



مصنفہ:

ڈاکٹر شکیلہ رافت علی

www.taemeernews.com

کیفی اعظمی: فکروفن

مصنفہ:
ڈاکٹر شکیلہ رافت علی



معیار پبلی کیشنز

www.taemeernews.com

جملہ حقوق محفوظ

Kaifi Azmi Fikr-o-fun
By:
Shakila Raft Ali

سن اشاعت : ۲۰۰۵ء
مطبع : اصیلا پرنٹنگ پریس، دہلی
قیمت : ایک سو روپے



معیار پبلی کیشنز

کے۔۳۰۲/ تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

www.taemeernews.com

فہرست

ماخوذ از کتاب:
کیفی اعظمی - عکس اور جہتیں
مرتبہ: شاہد ماہلی

www.taemeernews.com





کیفی آعظمی کے ساتھ مصنفہ

www.taemeernews.com

تعارف

اس کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر شکیلہ رافت علی ہماری بھتیجی ہیں یعنی میرے شوہر لیاقت علی کے بھائی کی بیٹی۔ شکیلہ کی پیدائش اور پرورش گورکھپور کے ایک ایسے روایتی خاندان میں ہوئی جہاں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ حالانکہ لڑکے نہ صرف علی گڑھ بلکہ ولایت بھی بھیجے جاتے تھے۔ یہ بہت سے خاندانوں میں عام سی بات تھی۔

شکیلہ اور اس کی بہنوں کی تعلیم کا سلسلہ ۱۹۶۵ء میں شروع ہوا۔ یہ قدم اٹھاتے ہی خاندان میں ہلچل مچ گئی اور اعتراضات کی بوچھار ہوگئی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ اپنے شاعر مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ہی کہہ گئے تھے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

www.taemeernews.com

شکیلہ اور اس کی بہنوں نے خاندان کے نامناسب اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ کچھ دنوں بعد رشتے داروں نے اعتراضات بند کر کے اپنی لڑکیوں کو بھی اسکولوں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ آج اس خاندان کی سب لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں اور بہت سی برسرِ روزگار بھی۔ شکیلہ اور اس کی بہنوں نے نہایت محنت اور عزم کے ساتھ پڑھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی تک کی تعلیم حاصل کر لی۔ شکیلہ کی دوسری بہنوں نے سیاست اور قانون جیسے مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کی اور اب سب یہیں یونیورسٹی اور کالجوں میں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں۔

شکیلہ کی ابتدائی تعلیم گورکھپور سے باہر لکھنؤ آ کر ہوئی جہاں سے اس نے ہائی اسکول پاس کیا۔ اس وقت تک گورکھپور میں لڑکیوں کی تعلیمی فضا سازگار ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہاں واپس جا کر انٹر سے لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں اعزاز کے ساتھ حاصل کیں۔ تعلیم کے خاتمے پر گورکھپور کے سنت اینڈ روز (St. Andrews) کالج نے اس کو شعبۂ اردو میں لکچرر مقرر کر کے نوازا۔

شکیلہ اور اسکی بہنوں کے تعلیمی کارناموں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اگر ان لڑکیوں کو تعلیم نہ دی جاتی تو کیسی ستم ظریفی ہوتی اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ ان بہنوں کی جیسی کئی اور لڑکیاں ہوں گی جنھیں کبھی اپنی خداداد ذہانت اور ذہنی صلاحیتوں کے استعمال اور مظاہرے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ یہ نہ صرف ان لڑکیوں کا بلکہ پوری قوم کا نقصان ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جبکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ

www.taemeernews.com

نے فرمایا ہے ''اِقرا باسم'' (پڑھو میرا نام لے کر) یہاں اللہ تعالیٰ صرف مردوں ہی سے مخاطب نہیں ہے بلکہ اپنے سب بندوں سے اسی طرح آنحضرت کی حدیث ہے ''اگر علم حاصل کرنے کے لئے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ'' یہاں بھی آنحضرت صرف مردوں سے مخاطب نہیں ہیں بلکہ اپنی پوری امت سے۔ تو پھر تمام ہی اسلامی ممالک میں عام طور سے تعلیم کی کمی اور خاص طور سے عورتوں میں تعلیم کی بہت زیادہ کمی کیوں ہے۔ یہ بات نہایت غور وفکر اور تحقیق کا موضوع ہے۔

صہبا لیاقت علی

(پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ایلی نوائے)

www.taemeernews.com

پیش لفظ

میرے بچپن میں جن شخصیتوں کا ہمارے یہاں بہت چرچہ تھا ان میں کیفی صاحب کا نام بھی تھا۔ احتشام حسین اور سبط حسن کے ساتھ ساتھ کیفی صاحب بھی ہمارے قصبے میں بہت یاد کیے جاتے تھے۔ احتشام صاحب تو ہمارے قصبے یعنی ماہُل کے تھے۔ مگر سبط حسن صاحب اور کیفی صاحب ماہُل سے بہت قریب امباری اور مجواں کے رہنے والے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب لوگ ماہُل میں جمع ہوتے تھے اور ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ مگر یہ باتیں میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی ہیں۔ سبط حسن صاحب پاکستان جا چکے تھے، احتشام صاحب لکھنؤ میں مقیم تھے اور کیفی صاحب نے ممبئی بسالی تھی۔ کیفی صاحب کا سارا خاندان پاکستان جاچکا تھا۔ ان کی بہت سی زمینیں دوسرے لوگوں نے ہڑپ لی تھیں۔ اس علاقے میں جب چک بندی شروع ہوئی تو سرکاری کاغذات میں

www.taemeernews.com

ان کے نام پر بہت سی زمینیں نکلیں۔ جسے کیفی صاحب خود بھی بھول چکے تھے۔ انہیں جب اطلاع ملی تو ان کی دلچسپی بڑھی۔ مدتوں بعد جب وہ اپنے گاؤں مجواں لوٹے تو گاؤں والوں نے ان کا گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ اپنی کھوئی ہوئی زمینیں پا کر کیفی صاحب کا تخلیقی ذہن بیدار ہوا۔ گاؤں کی حالت دیکھ کر انہیں بڑی تکلیف تھی۔ غربت اور ناخواندگی نے کچھ کرنے کے لیے انہیں مجبور کیا۔ فالج کی وجہ سے اپنی معذوری کے باوجود بڑے حوصلے اور عزم کے ساتھ انہوں نے گاؤں کی بہبودی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ پھولپور بازار سے ان کے گاؤں تک سڑک بنوائی گئی۔ اسکول، پوسٹ آفس اور ابھی حال ہی میں کمپیوٹر سنٹر اور بہت کچھ! جو اَب تاریخ بن چکی ہے۔

مجھے اس بات کا فخر ہے کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ دہلی جب بھی آتے، مجھ سے ضرور ملتے تھے۔ عام طور سے وہ کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈ آفس اجے بھون میں قیام کرتے تھے جو میرے آفس ایوانِ غالب سے بہت قریب ہے۔ کبھی خود آ جاتے کبھی مجھے بلا لیتے تھے۔ انہیں کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے ان کے پاس جانے کا مطلب کتابوں کا تحفہ لے کر جانا تھا۔ ان کے پاس اردو کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ محفوظ تھا جو انہوں نے مجواں میں منتقل کر دیا۔ دیکھیے اب اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟۔ جب میں نے ان سے ''معیار'' کا کیفی اعظمی نمبر نکالنے کی بات کی تو بہت خوش ہوئے اور ان پر لکھے ہوئے بہت سے مضامین کی فراہمی میں انہوں نے میری مدد کی۔ کچھ مضامین میں نے نئے لکھوائے۔ اس وقت یہ انکشاف بھی ہوا کہ کیفی صاحب پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کے بہت سے

ساتھیوں سے میں نے درخواست کی مگر بہت کم لوگوں نے ان پر مضامین لکھے۔ پھر بھی میری کتاب ''کیفی اعظمی۔عکس اور جہتیں'' ان کی حیات اور شاعری پر پہلی اور شاید آخری کتاب ہے۔ ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ کیفی صاحب کے انتقال کے بعد اخباروں میں جو کچھ شائع ہوا اُسے اِسی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کے چاروں مجموعے۔ جھنکار، آخرِ شب، آوارہ سجدے اور ابلیس کی دوسری مجلس شوریٰ۔ بھی نایاب ہو چکے تھے۔ جب میں نے ان کا کلیات ''سرمایہ'' شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تو پہلی بار انہوں نے اپنے بارے میں خود لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا اور ''میں اور میری شاعری'' کے عنوان سے ایک بھرپور مقدمہ تحریر کیا جو ''سرمایہ'' اور ''عکس اور جہتیں'' دونوں میں شامل ہے۔ کیفی صاحب اپنی شاعری کی طرف سے بہت غافل تھے۔ گذشتہ پچیس تیس برسوں میں انہوں کچھ خاص نہیں لکھا۔ دوسرے کاموں میں زیادہ مشغول رہے۔ گاؤں کے کاموں کے علاوہ مشاعرہ، فلم، ڈرامے، سمینار جلسے وغیرہ میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ میں نے اُن سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی یادیں لکھیں۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی آخری دم تک قائم رہی۔ میرا خیال ہے وہ واحد شخص تھے کہ جو ترقی پسند تحریک کی خوبیوں اور خامیوں پر بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔ یادوں کا ایک خزانہ ان کے پاس تھا۔ مگر وعدہ کر کے بھی انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ گذشتہ سال میرے ایک ہندی پبلشر دوست اردن مہیشوری کے ساتھ میں نے ممبئی کا سفر کیا اور بہت اصرار پر اردو بلٹز میں شائع شدہ ''نئی گلستاں'' کے تراشے اور چیتن آنند کی ایک

فلم ''ہیررانجھا'' جس میں کیفی صاحب نے منظوم مکالمے لکھے تھے۔ اس کا اسکرپٹ حاصل کیا گیا۔ یہ دونوں کتابیں ہندی میں شائع ہوگئی ہیں۔ اردو میں یہ دونوں کتابیں دوبارہ سے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ کیفی صاحب اپنی شاعری کی طرف سے غافل تھے مگر اپنی طرف سے نہیں۔ پبلسٹی کے بڑے ماہر تھے۔ کوئی موقع ایسا ضائع نہیں ہونے دیتے تھے جس سے انہیں نام ونمود ملنے کی امید ہو۔ کوئی بھی انعام واکرام ایسا باقی نہیں تھا جو انہوں نے نہ حاصل کیا ہو۔ کبھی کبھی حسد بھی ہوتی تھی۔ اور غصہ بھی آتا تھا کہ کاش کیفی صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو اپنی شاعری کے سجانے سنوارنے میں لگایا ہوتا تو شاید ان کی حیثیت اردو شاعری کی تاریخ میں آج کچھ اور ہوتی۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ صحافتی ہے۔ وقتی مسائل پر ان کی نظمیں خوب ہوتی تھیں۔ ۶ ردسمبر کے بعد ان کی نظم ''دوسرا بن باس'' بہت مقبول ہوئی۔ مگر ان کی رومانی شاعری کا معاملہ کچھ اور ہے۔ جس کا مطالعہ نئے سرے سے کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو شعر وادب میں کیفی اعظمی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ اردو شاعری سے ان کا رشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ کا ہے۔ اس نصف صدی کے ہنگامہ خیز حالات میں وہ اور ان کی شاعری نہایت صبر آزما مراحل سے گزری ہے کبھی روایت پرستوں نے ان پر انگلیاں اٹھائیں تو کبھی مذہب کے نام نہاد شیدائیوں نے ان پر زبردست حملے کیے کبھی ترقی پسند تحریک کے مخالفوں نے انہیں اپنا ہدف بنایا تو کبھی جدیدیت کے دعویداروں نے ان پر خاک اڑائی تو کبھی قانون کے محافظوں نے ان پر قدغن لگائی اور تو اور خود ترقی پسند ناقدین اور

مبصرین نے بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کے باوجود کیفی اعظمی اپنے ضمیر اور فن کے تئیں ایمانداری اور خلوص کا رویہ اختیار کر کے اپنی رنگارنگ عظیم تہذیب متعصبانہ سیاست کا شکار ہوتی ہوئی اپنی مظلوم لیکن زندہ و پائندہ زبان اور اس کے شعر و ادب کی قابلِ قدر روایات اور اپنے عہد کی آواز بن گئے۔

کیفی اعظمی کی شاعری ماضی کے انسانوں کے تجربات کو نئے طرز و اسلوب اور تشبیہہ و استعارات میں پیش کرنے کی سعی محض نہیں بلکہ وہ تو ان کے اپنے پر آشوب عہد کے حالات ماحول اور ذاتی و اجتماعی تجربات کا ثمرہ ہے۔ وہ دیکھی ہوئی اور بھوگی ہوئی سچائیوں سے عبارت ہے۔ اس سماج کی پیداوار ہے جس میں شاعر ایک حسّاس اور ذمّے دار رکن کی حیثیت سے زندگی گزار رہا اس کے سارے نشیب و فراز اور جزر و مد سے گزر رہا اور متاثر ہو رہا ہے۔

کیفی اعظمی اپنے عہد کے ان معنوں میں منفرد شاعر ہیں کہ انہوں نے عصر حاضر اور اس کے تقاضوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بہت سی نظمیں انہوں نے بمبئی کے ہفتہ وار ''قومی جنگ'' کے لیے بھی لکھیں جو ایک طرح سے منظوم اداریوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس طرح کی شاعری کو صحافتی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ منشی سجاد حسین کے ہفتہ وار ''اودھ پنچ'' لکھنؤ کا طرّہ امتیاز تھی۔ لیکن اس وقت سیاسی موضوعات دوسرے تھے۔ کیفی صاحب نے دوسری جنگ عظیم کے آخری برسوں میں ایسی شاعری کی۔ پھر سیاسی ہواؤں کا رُخ تیزی سے بدلنے لگا، نظریاتی طور پر کیفی صاحب بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ تھے لیکن بائیں بازو کی تحریک افراتفری کا شکار ہوگئی۔ کیفی کے تخلیقی سفر میں آخرِ شب کے

بعد جو خلاء پیدا ہوا اس کا بڑا سبب بائیں بازو کی تحریک کا انتشار ہے۔ اس کے بعد ان کی وابستگی فلموں سے زیادہ ہوگئی تھی اور ان کی شاعری میں بھی ایک موڑ آیا، اور وہ تغزل کے طرف بھی مائل ہوئے۔

کیفی اعظمی کی شاعری کا آغاز سفر رومان کی حسین و رنگین وادیوں سے ہوا تھا۔ احتیاط، پشیمانی، ملاقات، مجبوری، تصوّر، اندیشے اور نقش و نگار اور ایسی ہی ان کی دیگر رومانی نظمیں آج بھی اپنی تازگی، دلکشی، خوابنائی اور تاثر کی بنیاد پر اردو کی بہترین رومانی نظمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ فیض احمد فیض کی طرح (لیکن غالباً ان سے کچھ پہلے) کیفی اعظمی رومان سے انقلاب کی طرف آئے۔ ان کی اس دور کی نظموں میں مروجہ سیاسی و سماجی نظام کے خلاف غم و غصّے اور نفرت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ ان نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر ناقدین توازن قائم نہیں رکھ سکے کیفی اور ان کے ہم عصر ترقی پسند شعراء بقول سجّاد ظہیر، اگر ایک نظام کے خلاف غصّے اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں تو ان پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ شاعری کے باہر قدم رکھتے ہیں۔ غصہ، نفرت، محبت، یہی تو وہ جذباتی ماذہ ہے جس سے شاعر اپنے خیال کا مجسمہ لفظی توازن کی شکل میں تیار کرتا ہے۔

درحقیقت کیفی اعظمی کی شاعری کا ایماندارانہ مطالعہ ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات اور دم بدم بدلتی ہوئی زندگی کے وسیع تر پس منظر کے ساتھ ہی کیا جانا چاہیے۔

کیفی اعظمی نے اپنی شاعری میں اپنے آس پاس کے انسان کو کافی

اہمیت دی ہے اسی وجہ سے کیفی کی شخصیت ہمارے سامنے خواص پسند لوگوں کی شخصیت بن کر نہیں ابھرتی ہے بلکہ ان کا خطاب عوام سے ہے وہ اپنی شاعری میں زمین پر چلنے کے عادی ہیں انہوں نے ننگے پاؤں چل کر سنگ ریزوں اور کانٹوں کو اپنی شاعری میں مقتدر بنایا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں عام لوگوں کا ہجوم ہے اور وہ ان عام لوگوں کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہجوم ان کی آواز پر لپکتا چلا جا رہا ہے اور رجز خوان ہے۔

انسانیت سے جڑے رہنے کا جذبہ اور اس کے دکھوں کا احساس کیفی کے کلام میں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'آوارہ سجدے' ایک کیفیاتی تبدیلی کا مظہر ہے۔ جہاں کیفی کی رومانیت، انقلابی حقیقت پسندی اور انسان دوستی اظہار کا نیا پہلو اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں ایک حیران روزگار گزیدہ، جہاں ترسیدہ خود کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ دائرہ ''آخری رات'' اور ''عادت'' جیسی نظموں میں ایک شدید بے بسی کا احساس فکر و شعور پر حاوی ہو گیا ہے۔

محترمہ شکیلا رافت علی کی کتاب کیفی اعظمی کی حیات و خدمات کے حوالے سے ہے۔ آپ کی یہ کتاب آپ کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ڈاکٹر افغان اللہ کی نگرانی میں مکمل ہوا اب یہ کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ محترمہ نے اس کتاب میں کیفی اعظمی کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سردار جعفری اور

خلیل الرحمن اعظمی کی کتابوں کے بعد اس تحریک کا جائزہ باقی نہیں رہتا لیکن آپ نے اس تحریک کا ایک نئے زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ روایت سے بغاوت کا رجحان غالب کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ محمد حسین آزاد وغیرہ نے اس رجحان یا رویّے کو مزید طاقت بخشی۔ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر انگریزی ادب سے استفادے کی روش عام نہ ہوتی تو ترقی پسند تحریک یا نظریات کو عام ہونے میں وقت لگتا اور جتنی جلدی ہندوستان کے شعرا اور ادبا نے اس نظریہ کو قبول کر لیا اس میں بھی وقت لگتا۔ آپ نے اس کتاب میں کیفی اعظمی کی شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے جس میں آپ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اُنکی ابتدائی شاعری کس نوعیت کی تھی، ان پر اساتذہ کے اثرات کن کن صورتوں میں پڑے ہیں ساتھ ساتھ کیفی کی شاعری کے بتدریج ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی رومانی انقلابی اور سیاسی شاعری کا الگ الگ تجزیہ کیا گیا ہے۔

مجھے پوری امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں عزّت کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔

شاہد ماہلی

......

کیفی اعظمی: ایک نظر میں
(سوانحی خاکہ)

نام: سید اطہر حسین رضوی

والد: سید فتح حسین

تاریخ پیدائش: ۱۵ر اگست ۱۹۱۸ء

(مرزا شفیق حسین شفقؔ کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق)

مولد: موضع مجواں ضلع اعظم گڑھ، اتر پردیش

تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی۔ اس کے بعد دبیر ماہر، دبیر کامل (فارسی) اور عالم (عربی) لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ منشی، منشی کامل (فارسی) اور اعلیٰ کامل (اردو) الٰہ آباد یونیورسٹی سے۔

تصانیف: جھنکار (اولین شعری مجموعہ) ۱۹۴۳ء

آخرِ شب (دوسرا شعری مجموعہ) ۱۹۴۷ء

آوارہ سجدے (تیسرا شعری مجموعہ)　　۱۹۷۴ء

میری آواز سنو (فلمی نغمے)　　۱۹۷۴ء

ساحر لدھیانوی (طویل خاکہ)

ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)　　۱۹۷۷ء

سرمایہ (کلیات)　　۱۹۹۴ء

نئی گلستاں (ہندی): (ہفتہ وار اردو بلٹز بمبئی کے طنزیہ کالم
''نئی گلستاں کے تحت شائع ہونے والی تحریریں)

ہیر رانجھا (ہندی): فلم ہیر رانجھا کی مکمل (منظوم) اسکرپٹ

تصانیف جو کیفی اعظمی پر شائع ہوئیں:

معیار (دہلی) کیفی اعظمی نمبر

کیفی اعظمی: عکس اور جہتیں (مضامین) مرتب: شاہد ماہلی

کیفی اعظمی: فکر و فن اور شخصیت (اردو۔ ہندی)

مُرتبین: اطہر نبی۔ شاہنواز قریشی

پبلشر: سہارا انڈیا پریوار

اعزازات اور ایوارڈ:

پدم شری (جو کیفی صاحب نے قبول نہیں کیا)

بہترین کہانی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ (یہ بھی قبول نہیں کیا)

دلّی سرکار (اردو اکادمی) کا ملینیم ایوارڈ (۱۱ لاکھ روپے نقد)

حکومت اتر پردیش کا ایوارڈ (ایک لاکھ روپے نقد)

آوارہ سجدے پر:

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

اتر پردیش اُردو اکادمی ایوارڈ

مہاراشٹر اردو اکادمی ایوارڈ

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ

دیگر ایوارڈز:

لوٹس ایوارڈ

قومی یک جہتی کا پریسیڈنٹ ایوارڈ (فلم سات ہندستانی کے ایک گیت پر)

بہترین کہانی کا فلم فیر ایوارڈ

بہترین فلم اسکرین پلے کا فلم فیر ایوارڈ

بہترین فلم مکالمے کا فلم فیر ایوارڈ

ریاست مہاراشٹر کا گورو ایوارڈ (ایک لاکھ روپے نقد)

ایفرو ایشین رائٹرس ایوارڈ

حکومت مہاراشٹر کا گیا نیشور ایوارڈ

ماہنامہ ''آپ کی کائنات'' دہلی کی جانب سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ

ساہتیہ اکادمی فیلوشپ

ہندی اردو ادب ایوارڈ کمیٹی (اتر پردیش) کا ایوارڈ

تاریخ وفات: ۱۰ر مئی ۲۰۰۲ء (ممبئی)

کیفی اعظمی۔ حیات اور خاندان

کیفی اعظمی ۱۹۱۸ء میں یو پی کے ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل پھول پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''مجواں'' میں ایک زمیندار مسلم شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی صحیح تاریخ پیدائش ہزار کوششوں کے باوجود بھی معلوم نہ ہوسکی۔ کیفی خود اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''تاریخِ پیدائش یاد نہیں، تاریخِ وفات معلوم نہیں۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں اور آزاد ہندوستان میں جی رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی کا خاندان کہیں دور سے آ کر مجواں میں آباد ہوا۔ یہ خاندان کہاں سے منتقل ہو کر آیا اس کی صحیح اطلاع کسی کے پاس نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ خود کیفی صاحب اور بڑے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے اس کے مطابق یہ خاندان نقلِ مکانی کر کے یہاں آباد ہوا۔ بقول کیفی:

''میں نے سنا ہے بزرگوں سے اپنے کہ یہاں کے قریب کوئی جگہ ہے
گڑگاؤں وہاں سے یہ خاندان آیا۔ اب یہ سنا ہے اس کا کوئی پہلے کا ریکارڈ
میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میری نظر میں ہے''۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی صاحب کے بزرگ عطا حسین کی نسبت سے کیفی کے خاندان کا
سلسلہ یوں ہے۔

عطا حسین

|

فتح حسین

|

ظفر حسین یوسف حسین شبیر حسین اطہر حسین قمر النسا محسنہ آمنہ واجدہ

شبانہ اعظمی

بابا اعظمی

کیفی صاحب کے والد فتح حسین صاحب کے آٹھ اولادیں ہوئیں جن
میں چار لڑکے اور چار لڑکیاں۔ لڑکوں میں سب سے بڑے ظفر حسین تھے جن
کا تخلص مجروحؔ تھا اس کے بعد منجھلے بھائی، جن کا نام یوسف حسین اور تخلص بیتابؔ
تھا۔ اس کے بعد شبیر حسین، یہ بھی اچھے شاعر تھے۔ اس کے بعد اطہر حسین تخلص
کیفیؔ اعظمی۔ بہنوں میں قمر النسا، محسنہ، آمنہ اس کے بعد واجدہ تھیں۔

کیفی اعظمی جن کا نام اطہر حسین ہے اپنے بھائی بہنوں میں سب سے
چھوٹے ہیں۔ ان سے بھی خاندانی سلسلہ آگے بڑھا اور ان کے بھی تین بچے

پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا لڑکا ایک سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد شبانہ اعظمی ہوئیں جو آج کل ہندوستانی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھا رہی ہیں اور جنہیں اس سلسلے میں متعدد اعزازات و انعامات سے نوازا گیا ہے۔ شبانہ اعظمی سے چھوٹا لڑکا بابا اعظمی کے نام سے جانا جاتا ہے جو فلمی دنیا میں فوٹو گرافی کے شعبہ سے وابستہ ہے۔

کیفی صاحب جس گاؤں میں پیدا ہوئے وہ بہت ہی چھوٹا تھا جس کی آبادی قلیل تھی اور اکثر غربا کی بستی تھی مگر اب کیفی صاحب کی نسبت سے کچھ ترقی کر گیا ہے۔ اس گاؤں کی واحد سڑک جو گاؤں سے نکل کر پھول پور اور شاہ گنج والی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اب یہ سڑک پختہ بن چکی ہے۔ اس گاؤں میں ایک پوسٹ آفس بھی قائم کر دیا گیا ہے۔

کیفی صاحب کے بزرگوں میں ان کے والد فتح حسین صاحب کو شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اس لیے کیفی نے جب ہوش سنبھالا تو انہیں اپنے اردگرد جو ماحول نظر آیا اس میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ بچپن سے ہی ان کے کانوں میں اشعار کی گونج پہنچ رہی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں اساتذہ کے کلام کو پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ چونکہ وہ شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے مجلسوں کے توسط سے مرثیہ اور خاص طور سے انیس کے مراثی سے واقف ہوئے۔ کیفی صاحب کی دادی انہیں اچھی اچھی کہانیاں سناتی تھیں، ان کی کہانیاں سننے کے لیے گاؤں کے زیادہ تر لوگ اکٹھا ہو جایا کرتے تھے، مگر اس

چھوٹی سی عمر میں کیفؔی صاحب کو کہانیاں سننے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے وہ کہانی سننے کے بجائے اپنی بڑی بہن سے سوتے وقت بلا ناغہ ضد کر کے آٹھ دس بند میر انیس کے مرثیہ کا ضرور سنتے۔ جب تک کہ وہ سن نہ لیتے اس وقت تک نہ خود سوتے نہ اپنی بڑی بہن کو سونے دیتے۔ بچپن میں میر انیؔس کے مراثی سے کیفؔی صاحب بہت زیادہ متاثر ہوئے جس کا اعتراف کرتے ہوئے کیفؔی صاحب خود فرماتے ہیں:

''میر انیؔس کے اثرات میری شاعری پر بہت واضح اور نمایاں دیکھا جاسکے گا۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفؔی صاحب کی ابتدائی شاعری میں خاص طور سے ''جھنکار'' اور ''آخرِ شب'' میں انیس کی شاعری کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ البتہ ''آوارہ سجدے'' میں آ کر کیفؔی صاحب کا اندازِ بیان تبدیل ہوگیا ہے۔ انیؔس کی شاعری کا بیانیہ انداز کیفؔی صاحب کے مجموعۂ کلام ''جھنکار'' اور ''آخرِ شب'' میں جتنا صاف نظر آتا ہے اتنا ''آوارہ سجدے'' میں نہیں:

گولیوں سے نہ جھجکتے نہ یہ سنگینوں سے
اپنی تنظیم پہ، تحریک پہ مغرور ہیں یہ
(کیفؔی)

زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں پیاسا ہوں میں
(میر انیؔس)

کیفؔی صاحب کے والد چونکہ زمیندار تھے اس لئے کیفؔی صاحب یا ان کے خاندان کے سامنے کوئی معاشی مسئلہ نہیں تھا،لیکن تغیرِ زمانہ کی وجہ سے یہ احساس قوی ہوتا گیا کہ صرف زمینداری سے سب کچھ ہونے والا نہیں ہے بلکہ آنے والے زمانے میں بچوں کے لئے جدید تعلیم کی ضرورت ہے۔اس لیے کیفؔی صاحب کے والد نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کیا۔اسی سلسلے میں انہوں نے مجواں چھوڑا۔اودھ کی ایک ریاست بلہرا میں ایک مکان کرایہ پر لیا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ قیام پذیر ہوئے تاکہ جدید زمانے کے لحاظ سے بچوں کی تعلیم وتربیت ہوسکے۔

کیفؔی صاحب کے والد نے اپنے بڑے لڑکے کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم دلوائی اور باقی کو لکھنؤ میں تعلیم دلوائی اور لڑکیوں کو گھریلو تعلیم دی۔ان کے والد کی تربیت کا ڈھنگ بہت دلچسپ تھا۔اس سلسلے میں ایک دو واقعات بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے اندازِ فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک واقعہ کیفؔی صاحب کی زبانی سنیے:

’’بابو خاں بیٹھے ہوئے تھے ابا کے ساتھ۔ میں باہر سے کہیں گلی ڈنڈا کھیل کے آرہا تھا۔میں نے دیکھا اور جھٹ سے گھر میں چلا گیا۔ان کو سلام نہیں کیا۔ابا کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سامنے کسی کے نہیں ڈانٹتے تھے۔وہ جب چلے گئے تو اس کے بعد ابا نے بلایا مجھے اور پوچھا کہ بھئی وہ تمہارے بابو چچا بیٹھے تھے تم نے سلام نہیں کیا۔میں نے کہا میں بھول گیا۔کہاں ہاں ہوجاتی ہے آدمی سے بھول، کوئی ایسی بات نہیں تو اچھا ایسا کرو کہ یہاں جتنے تاڑ ہیں سب کو آداب کرو۔ہم

جھک جھک کر خوب آداب کر رہے ہیں اور رو رہے ہیں اور وہ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ خوب گھنٹوں یہ مشق کرائی۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اب تک کوئی بزرگ آجائے تو ہاتھ اٹھے بغیر نہیں رہتا''۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی کی ابتدائی تعلیم ان کے اپنے تینوں بڑے بھائیوں سے مختلف ہوئی۔ بڑے بھائیوں کو انگریزی اسکول میں داخل کیا گیا لیکن کیفی کو ان کے والد نے اس وقت کے شمالی ہند کی سب سے بڑی دینی درسگاہ لکھنؤ کے سلطان المدارس میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چودہ سال کی عمر میں داخل کر دیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کیفی صاحب کی چار بہنیں یکے بعد دیگرے دق جیسے موذی مرض میں انتقال کر گئیں۔ اس سے ان کے والد کے دماغ میں یہ بات آئی کہ شاید ہو سکتا ہے کہ بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے سے قدرت کی طرف سے انہیں یہ سزا مل رہی ہے۔

سلطان المدارس میں داخلے سے قبل ۱۹۲۹ء میں کیفی کی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا جو خالص رومانی شاعری تھی۔ سلطان المدارس میں داخلے کے بعد کیفی نے صدر سلطان المدارس کی مرضی کے خلاف طالب علموں کی ایک تنظیم بنائی۔ یہیں سے کیفی کی شاعری میں ایجی ٹیشن کیریکٹر کا آغاز ہوتا ہے، جو ان کی شاعری کے میدان میں ایک اہم موڑ ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے کیفی صاحب خود فرماتے ہیں:

''تو پھر وہ حسین آباد کے کارندے تھے۔ وہ رات کو ڈنڈے لے کے آئے ہماری پٹائی ہوئی مارے گئے۔ میرے اب تک کہنی پر نشان ہوں گے۔

لیکن ہم بھی کوئی گاندھی وادی نہیں تھے۔ ہم نے بھی مارا اور اپنی جگہ پر قائم رہے۔ روم میں گھسنے نہیں دیا اس پر قابض رہے۔ دوسرے دن صبح ہی سے میری شاعری میں موڑ آیا۔ یہ جو میری شاعری میں ایجی ٹیشن کیریکٹر ہے وہ اس زمانے کا ہے۔ میں روز تقریباً ایک ایسی نظم کہہ لیتا تھا جو طالب علموں میں پڑھی جاتی تھی اور ان میں جوش بڑھتا تھا۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی اعظمی اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے عائشہ صدیقی (افسانہ نگار) کے اس جملے کا حوالہ ضرور دیتے ہیں:

> ''صاحب وہ ماں باپ نے اس لیے سلطان المدارس میں داخل کردیا تھا کہ وہاں سے یہ نکل کے مولوی بن کر ان لوگوں پر فاتحہ پڑھیں گے لیکن یہ وہاں مذہب کا فاتحہ پڑھ کے نکل آئے'' (گفتگو کا ریکارڈ)

مولویوں کی صحبت کیفی نہیں جھیل سکے۔ دینی تعلیم سے ان کا جی اکھڑ گیا اور مشکل سے اپنی تعلیم ختم کی۔ اس کے بعد دین کی خدمت تو نہ کر سکے مگر اردو ادب کی خدمت بخوبی انجام دیتے رہے اور آج بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔

گھر میں شعر و شاعری کا ماحول شروع ہی سے رہا۔ والد شاعر ہونے کے علاوہ شاعر پسند اور شاعر پرست بھی تھے۔ اچھی سی غزل یا نظم کہنے والے بیٹوں کو انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اس وقت کیفی ان میں شامل نہ تھے۔ بقول کیفی:

"میرا کام صرف یہ تھا کہ بڑوں کی خدمت کروں اور ڈانٹ کھاؤں"

لہٰذا بڑے بزرگوں کی صحبت میں شریک نہ ہونے کی رکاوٹ اور کم عمر کا بچہ سمجھ کر نظر انداز کیا جانا کیفی کے لیے بہت ہی رنج کا باعث تھا چونکہ کیفی بچپن سے ایک حساس طبیعت کے مالک تھے اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کے متعلق چھوٹی عمر میں پیش گوئی کی تھی کہ "ایک دن میں ضرور ہندوستان کا بڑا شاعر بنوں گا"۔ اپنی شاعری کے متعلق کیفی کی یہ پیش گوئی آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ آج کیفی اعظمی نہ صرف ہندوستان کے بلکہ بین الاقوامی شہرت کے حامل شعرا میں سرِ فہرست ہیں۔

کیفی کی پہلی نظم "سرفراز" لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس زمانے میں وہ چپکے چپکے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ کر "قومی جنگ" کو بھیجنے لگے لیکن نظموں پر نہ تو نام ہوتا تھا اور نہ ہی پتہ۔ پی۔سی۔ جوشی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری نظمیں دیکھتے اور حیران اس بات پر ہوتے کہ یہ شخص اپنا نام اور پتہ کیوں نہیں لکھتا۔ پھر وہ لوگ یہ سوچتے کہ ہوسکتا ہے وہ سرکاری ملازم ہو اس وجہ سے نام لکھنے سے ڈرتا ہے۔ کیفی اعظمی کی تلاش لکھنؤ میں شروع ہوگئی اور ایک دن ایک مشاعرے میں سردار جعفری نے کیفی اعظمی کو ڈھونڈ لیا۔

سجاد ظہیر نے کیفی کو بمبئی چلنے کو کہا اور کیفی تیار ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر انیس سال تھی۔ جب کیفی صاحب کے گھر والوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہ بمبئی جارہے ہیں تو ان کے گھر والے بہت ناراض ہوئے۔ اور ان کے اس پروگرام کی سخت مخالفت ہوئی۔ خاص طور سے ان کے منجھلے بھائی جو ایک وکیل تھے

انہوں نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کیفؔی اعظمی کو سمجھانے کے لئے اپنے والد کو بھی لکھنؤ بلایا۔ اتفاق سے کیفؔی صاحب کو اس وقت تیز بخار تھا اور سردی کی کیفیت تھی۔ اس حالت میں ان کی زبان سے جو جملے نکل رہے تھے وہ یہ تھے:

''کمیونسٹ پارٹی زندہ باد

لال جھنڈا زندہ باد

لال فوج زندہ باد'' (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفؔی کے والد نے جب یہ سنا تو اپنے منجھلے لڑکے کو جو وکیل تھے سمجھایا:

...اب تم ان کو روک کر کیا کرو گے اب یہ ہمارے کس کام کے ہیں۔ اب ان سے کہو کہ اب تم جتنے جلدی اچھے ہو جاؤ گے اتنے جلدی بھیج دیے جاؤ گے۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفؔی صاحب تھوڑے ہی دنوں میں ٹھیک ہو گئے تو اسی درمیان سجاؔد ظہیر کیفؔی کو بمبئ لے گئے۔ یہ تقریباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا یہ ان کی زندگی کا ایک نیا اور اہم موڑ تھا۔

کیفؔی کے بمبئ پہنچنے کے بعد ان کے والد نے ان کو ایک خط لکھا جس سے کیفؔی بہت متاثر ہوئے اور اس خط کو سجاؔد ظہیر نے بھی پڑھا اور اسے انگریزی میں ترجمہ کر کے پیوپلز یا بلٹز جو اس زمانے میں خاصا مشہور تھے اس کے پہلے صفحے پر شائع کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا:

''دیکھو تم نے جو راستہ اپنے لئے چنا ہے اس کے

بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے سیاست سے نہ
دلچسپی رہی ہے کبھی، نہ اب بھی ہے اور نہ میں جانتا ہوں
کہ اس میں کیا صحیح ہے کیا غلط۔ تم جس پارٹی میں گئے ہو
اس کے بارے میں میں نے یہ سنا ہے کہ اس میں
نوجوان جیل میں جاتا ہے، بوڑھا ہو کر نکلتا ہے۔ اگر اس
کی ہمت ہے تو جاؤ تو اب بھاگنا نہیں۔ گئے ہو تو پھر
مبارک ہو، تو اس کو جھیلو۔ ایسا نہ کرنا کہ اس کے بعد پھر
واپس آؤ۔ اور اگر کوئی کمزوری ہے تو ابھی چلے آؤ،
ہٹاؤ۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

اس خط سے کیفؔی صاحب کو کافی تقویت ملی۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی طرح کی کوئی کمزوری پیدا بھی ہوتی اور یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں کیفؔی کے قدم ڈگمگا بھی گئے ہوتے لیکن اس خط نے ہمیشہ ان کا حوصلہ بڑھایا۔ ایک طرح سے یہ خط ان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔

کیفؔی اعظمی بمبئی پہنچے تو ان کی ہر طرح سے پذیرائی ہوئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے بھی انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ۱۹۴۳ء میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی ممبر ہو گئے۔ اس زمانے میں پارٹی کے مشہور اخبارات قومی جنگ جو بعد میں نیا زمانہ کے نام سے نکلنے لگا اور بلٹز پیپلز کے پہلے صفحے پر کیفؔی کی نظمیں شائع ہونا شروع ہوئیں جس سے انہیں شہرت ملی۔

کیفؔی اعظمی کی شخصیت کی اور کئی خصوصیات ہیں جس میں بچپن سے لے

کر اب تک کوئی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے سستی شہرت سے ہمیشہ نفرت کی اور شہرت کے لیے کبھی کوئی کام نہیں کیا پھر بھی ان کی فطری ذہانت اور ان کے شعور کی چمک ضرور پھیلی ہے۔ ان کی ذہانت، شعور اور ادراک ان کی صلاحیتوں اور کاموں میں نمایاں ہیں۔ کیفی صاحب بے جا تعریف اور توصیف کے عادی نہیں ہیں، بلکہ اگر ایسی صورت سے سابقہ پڑ جائے تو بہت الجھن محسوس کرتے ہیں اور اس سے بچ نکلنے کی فوراً کوشش کرتے ہیں۔ یہ اوصاف آج بھی کیفی صاحب کی شخصیت میں موجود ہیں۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء کی بات ہے کہ 'افرو ایشیائی ادیبوں کی انجمن نے ''لوٹس ایوارڈ'' اردو کے ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کو دینے کا فیصلہ کیا۔ امنِ عالم اور علم و ادب کی خدمت کے اعتراف کے طور پر ملنے والا یہ سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ کیفی صاحب نے اپنے قلم اور عمل سے اپنے ملک کے دبے کچلے عوام کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی علالت کے باوجود ہمیشہ عملی میدان میں دکھائی دیتے ہیں اور پرولتاری طبقے سے اپنے تعلقات کو بڑی خوش دلی سے نبھاتے ہیں جس کے صلے میں انہیں ''لوٹس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ''لوٹس ایوارڈ'' ملنے پر انکساری کا اظہار انہیں کے الفاظ میں:

''میری زبان میں کئی ایسے شاعر اور ادیب موجود ہیں۔
اگر میں جیوری میں ہوتا تو ان ناموں کی سفارش کرتا لیکن
یہ انعام مجھے دیا گیا ہے تو میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔
لیکن چونکہ میں اپنی شاعری کو ایشیا، افریقہ کی آزادی کے
لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہوں اور یہ انعام شاید

اس صلے میں ملا ہے۔ اس طرح میری جو عزت افزائی کی
گئی ہے وہ میرے لئے قابلِ فخر ہے۔ اب تک ہمارا جو
شعری رویہ رہا اس میں اور جوش آئے گا اور میں
ایفرو ایشیا عوام کی جدوجہد اور خود اپنے ملک میں سیکولرزم
کی قوت کو مضبوط کرنے کی جدوجہد کرتا رہوں گا اور
اپنے نوجوان شاعروں اور ادیبوں سے بھی خواہش
کروں گا کہ وہ نئی دنیا کی تعمیر اور نیوکلیر جنگ کو روکنے کی
انسانی جدوجہد میں حصہ لیں'' (ہفتہ وار بلٹز، کیفی اعظمی کو
لوٹس ایوارڈ، سنیچر ۲۹/ اکتوبر ۱۹۸۳ء، ص ۱۸)

کیفی اعظمی کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ایسے کارنامے ہیں جن سے ان کی تنظیمی صلاحیت، باریک بینی اور نکتہ فہمی کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے اندر پیش روی کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ جس وقت چاہتے ہیں اسی وقت اپنے سبھی رفیقوں کو متحرک کر دیتے ہیں اور ان کے اندر جوش و خروش پیدا کر کے کسی بھی مسئلے میں اصل نکتے کو پکڑ لیتے ہیں۔ اگر اختلاف ہوتا ہے تو وہاں بھی اخلاق کا دامن نہیں چھوڑتے۔

کیفی کی دوسری بڑی خوبی بے لوث ہمدردی ہے۔ اپنے رفیقوں اور دوستوں سے محبت اور پیار کے سوا کچھ اور طلب نہیں کیا۔ برسوں تک وہ خود اور ان کے بچے سخت پریشانی میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ پہلا بچہ غربت کا شکار ہوا۔ لگاتار بمبئی کے وسیع علاقوں میں قوم کی خدمت اور بھلائی کے لئے پیدل سفر

کرتے۔ کبھی کھانا ملتا اور کبھی نہیں لیکن کیفی کی لگن میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کیفی اعظمی نے ہمیشہ ترقی پسند اور صحت مند تحریکوں کا ساتھ دیا ہے اور اس میں حصہ لیا ہے۔ کیفی کی نظر عالمی مسائل پر ہر وقت رہتی ہے اور آج دنیا کے سر پر جو خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ اس سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ وہ ایسی طاقتوں کے سخت مخالف ہیں جو عالمی امن کے لئے خطرہ بنی ہوئی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد فسادات نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس سے قتل وخون اور غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ اس خونیں سانحے نے تمام ترقی پسند شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کیفی کا حساس دل بھی اس خوں آشام حادثے کو برداشت نہ کرسکا۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن وامان قائم کرنے کی پُرزور اپیل کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں سرحد کے تنازعہ کی بنا پر چین وپاکستان کے دوبارہ حملے پر کیفی نے امن کا پرچم بلند کیا اور صلح وآشتی کا پیغام دیا۔

فکر معاش:

جس وقت کیفی بمبئی پہنچے تو ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کے بعد پارٹی کی طرف سے ۴۵ روپیہ ماہوار ملنے لگا۔ اس مختصر سی آمدنی میں کیفی کا خرچہ مشکل سے چلتا تھا۔ شادی ہو جانے سے اخراجات اور بڑھے اس لیے ایک روزنامہ اخبار میں پانچ روپیہ روزانہ پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی۔ کچھ دنوں بعد بیوی نے بھی کام کرنا شروع کیا۔ ویسے ان کی بیوی کی

تعلیم صرف ہائی اسکول ہے۔ مگر انہوں نے جس کام میں حصہ لیا اسے بخوبی انجام دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ''انڈین پیوپلز تھیٹر'' میں کام کرنا شروع کیا اور آج تک کرتی آرہی ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو ڈرامے میں بھی حصہ لیتی تھیں اور کبھی کبھی فلم کی ڈبنگ بھی مل جاتی۔ اس کے بعد پارٹی نے ''نیا ادب'' کے اڈیٹر کی حیثیت سے دو سو روپے ماہوار مقرر کردی۔ بقول شوکت کیفی:

''کیفی کی پارٹی سے آمدنی صرف پینتالیس روپے تھی جس میں تیس روپے کھانے کے کٹ جاتے تھے۔ باقی رہے پندرہ تو اس میں سگریٹ اور ریلوے پاس کا خرچہ۔ میرے لیے کوئی پیسہ نہ بچتا تھا، پارٹی تنخواہ مجھے نہیں مل سکتی تھی۔ مجھے پالنے کے لیے کیفی نے ایک ڈیلی نیوز پیپرس میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی۔ کبھی کبھی تو مجھے ان پر رحم آنے لگتا۔ آنکھ کھلتے ہی انہیں یہ گھبراہٹ ہوتی کہ نظم لکھنی ہے اور فوراً کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتے۔

کیفی چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مزدوروں میں کام کروں۔ لیکن میں نے ''انڈین تھیٹر پیوپلز'' کا اسٹیج اپنے لیے چن لیا تھا اور آج تک اس میں کام کرتی ہوں۔ میں کمانے کے لیے ریڈیو ڈرامے میں بھی حصہ لینے لگی۔ کبھی فلم کی ڈبنگ مل جاتی ہے۔ پارٹی نے کیفی

کی دقّت کو محسوس کیا اور ''نیا ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت
سے دو سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔
(ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔کیفی اعظمی نمبر،شوکت
کیفی،کیفی میرے ہمسفر،شمارہ ۲، ۱۹۸۳،ص ۲۵_۲۴)

فلمی دنیا سے تعلق:

کیفؔی کا پہلا بچہ غربت کا شکار ہو گیا اس کے متعلق شوکت کیفؔی فرماتی
ہیں:

''کیفؔی کو یہ فکر تھی کہ پہلا بچہ تو غربت کی نذر ہو گیا۔ اب
اس بچی کے لیے انہیں پیسہ کمانے کی فکر تھی چنانچہ
انہوں نے فلموں میں گانے لکھنے شروع کر دیے''۔
(ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔کیفی اعظمی نمبر،شوکت کیفی،کیفی
میرے ہمسفر،شمارہ ۲، ۱۹۸۳،ص ۲۶)

لہٰذا جب شبانہ پیدا ہوئیں تو ان کے لیے پیسے کمانے کی فکر کیفؔی کو ہوئی اور انہوں
نے فلموں میں گانا لکھنا شروع کر دیا اور یہیں سے کیفی کی فلمی دنیا کا آغاز ہوتا ہے
جس سے ان کا تعلق کچھ نہ کچھ آج بھی قائم ہے۔ سب سے پہلے شاہد لطیف نے
انہیں اپنی فلم ''بزدل'' کے لیے دو گانے دیے۔

''روتے روتے گزر گئی رات رے''

''کاہے رے بلم'' (ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔کیفی اعظمی نمبر،شوکت کیفی،
کیفی میرے ہمسفر،شمارہ ۲، ۱۹۸۳،ص ۲۶)

دونوں گانوں کا معاوضہ انہوں نے کیفی کو ایک ہزار روپیہ دیا۔

کیفی اپنی بیٹی کو اچھے انگلش اسکول میں پڑھانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بمبئی کے ''کوین میری'' ہائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اس کے بعد کیفی کو آہستہ آہستہ فلموں میں کام ملنے لگا۔ اب وہ گھر کے اخراجات کو برداشت کرنے کے متحمل ہو گئے۔ ایک طرف تو پارٹی کا کام بھی بخوبی انجام دیتے اور دوسری طرف فلموں میں گانے لکھتے۔ گرودت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' میں گانا لکھا جو بہت مشہور رہا۔ سہگل کی فلم ''شعلہ اور شبنم'' کا گانا بھی بہت مقبول ہوا جیسے

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں
راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

(ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔ کیفی اعظمی نمبر، شوکت کیفی، کیفی میرے ہمسفر، شمارہ ۲، ۱۹۸۳، ص ۲۷)

پہلے تو کیفی پارٹی والوں کے ساتھ رہتے تھے بعد میں جوہو کے ایک کاٹج میں رہنے لگے اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

فلمی دنیا میں کیفی کے دو کارنامے ہیں ایک تو چیتن کی فلم ''ہیر رانجھا'' جو پوری منظوم فلم ہے اس فلم کو منظوم کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا لیکن کیفی نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ یہ فلم بہت مقبول ہوئی۔ دوسری فلم ''گرم ہوا'' ہے جس کی کہانی، مکالمہ اور اسکرین پلے کیفی کا لکھا ہوا ہے۔ کیفی کو فلم فیئر کے تین ایوارڈ ملے۔ کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کا۔ کہانی کے لیے نیشنل ایوارڈ بھی ملا ہے۔

کیفی ایک مدت سے فلمی دنیا سے وابستہ ہیں اور اس میں کچھ ایسے

کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جسے فلمی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ''گرم ہوا'' پہلی جرأت مندانہ سیاسی فلم ہے جس میں ملک کی تقسیم اور اس کے نتائج کو بڑی حقیقت پسندی، بڑی لگن اور بڑے درد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالبؔ کی صدسالہ تقریبات کے موقع پر سَتھیو نے ایک مختصر سی فلم غالبؔ کے متعلق بنائی تھی۔ یہ دستاویزی خوبصورت فلم کیفیؔ کی لکھی ہوئی ہے اور اس میں آواز بھی کیفی ہی کی ہے۔ غالبؔ سے متعلق پوری فیچر فلم جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین کے دست مبارک سے ہوا تھا ابھی تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی۔ فلم غالبؔ سے متعلق محمد مہدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''اب تو سنا ہے کہ ایک مشہور ڈائریکٹر کیفیؔ سے غالبؔ کی اسکرپٹ بھی لے گئے اور اعلان کر دیا کہ اسکرپٹ کھو گئی۔ کیفی کو غالب سے کتنا لگاؤ ہے اور اس فلم میں وہ کس قدر الجھے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان کے کچھ خطوں سے ہو سکتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خط میرے نام ہیں اور کچھ میری بیوی کے نام۔ وہ فلم تو نہ بن سکی۔ لیکن اس کی یاد دلوں میں اب بھی باقی ہے''۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو اپنے دوست مہدی صاحب کو خط لکھتے ہوئے غالبؔ کی فلم کے متعلق کیفیؔ صاحب خود فرماتے ہیں:

> ''آج کل مصروفیت زیادہ ہے اور مصروفیت بھی بلاوجہ کی۔ غالب نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ فلم میں

جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی صرف دو وجہیں ہیں ایک تو
غالب نہیں مل رہے ہیں دوسرے کہانی ابھی مکمل نہیں
ہوئی ہے۔ اب تھک ہار کر جو فیصلہ ہوا مجھے یقین ہے کہ تم
زیادہ اس کو پسند نہ کرو گے۔ ہم لوگ صبح سات بجے
اشوک کمار کو سائن کرنے جا رہے ہیں۔ غالب، اشوک
کمار، امراؤ بیگم مینا کماری، ڈومنی۔ ممتاز۔ میرے خیال
میں اگر ایکٹر ہی لینا ہے تو اشوک کمار سے بہتر کوئی نہیں
ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے لیکن یہ بھی سچ
ہے کہ ہم غالب کے جس حصہ پر زیادہ زور دے رہے
ہیں وہ ان کی جوانی نہیں بڑھاپا ہے''

(ماہنامہ ''سہیل'' گیا۔ منصوبہ اور مکاتیب نمبر کی
روشنی میں۔ از سید محمد مہدی شمارہ ۲، ۱۹۸۳، ص ۴۷)

سیاسی زندگی کا آغاز:

لکھنؤ سلطان المدارس سے دینی تعلیم ختم کرنے کے بعد بمبئی کے
کمیونسٹ اردو ہفتہ وار میں کام کرنے کے لیے چنے گئے تو ایک مخلص کمیونسٹ
کارکن کی حیثیت سے ابھرے اور ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے اہم اور نمایاں
کارکنوں میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی ممبر ہو گئے۔ اس
زمانے میں پارٹی کے اخبارات کے پہلے صفحہ پر کیفی کی نظمیں شائع ہونا شروع
ہوئیں۔ کیفی کی سیاسی وابستگی آج بھی کمیونسٹ نظریے سے ہے آج بھی ان کی

تمام نظموں میں سیاسی مسائل کی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے سیاسی عقائد اشتراکیت، بقائے باہمی اور امن عالم کے نظریات پر مشتمل ہیں۔

ترقی پسند شاعر:

کیفی ممتاز ترقی پسند شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر وہ مارکسزم کے پیرو کار ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی ان کے اشتراکی رجحان کی وجہ سے ہوئی۔ برسوں تک خود وہ اور ان کا چھوٹا سا خاندان سب نے سخت پریشانیاں جھیلیں اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرے مگر سیاسی کاموں میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ مظلوم مل مزدوروں، کسان مزدوروں سب کا ساتھ دینے کے لیے اپنی پروا کیے بغیر آگے آگے چلتے رہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ انہیں کھانے کی بھی فرصت نہیں ملی ہے اور بغیر کھائے سیاسی کاموں میں لگے رہتے۔ اکثر فلم کے کاموں میں تاخیر سے پیسے ملتے جب کہ گھر کے اخراجات ناگزیر ہوتے پھر بھی کیفی ان مظلوموں مزدوروں کی ضرورتوں کو زیادہ ترجیح دیتے۔ کرایہ داروں اور ضمنی کرایہ داروں کے تحفظ کا قانون بنانے کے لیے بڑی حد تک حکومت کو جھکانے میں کامیاب ہوئے اور کرایہ داروں کی ایک متحرک تنظیم بن گئی۔۔ حسبِ معمول کیفی صاحب اس کے روح رواں تھے۔ گوا کو آزاد کرانے کی مہم بمبئی میں بڑے زوروں سے چلی تو اس میں بھی کیفی پیش پیش رہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب کیرالا میں پہلی نمبو دری پر وزارت کو توڑا گیا تو پورے ملک میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ بمبئی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ بطور احتجاج ایک زبردست جلوس نکالا گیا۔ کیفی اس جلوس میں شروع سے آخر تک رہے۔

۱۹۵۱ء میں کیفی کئی مہینے تک انڈر گراؤنڈ رہے۔ انہیں کئی بار جیل جانا پڑا اور کئی بار اکثر چھپ کر بچ نکلے کئی وارنٹ بھی جاری ہوئے مگر اس سے بھی بچ نکلے۔

ایک سچا کمیونسٹ فن کار عوام سے ہم آہنگی کو جزو ایمان سمجھتا ہے وہ ان کی رہنمائی کرتا ہے اور ان سے سیکھتا بھی ہے۔ اس لیے ان کے فن اور عملی سرگرمیوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ عوام سے ہم آہنگی کا رویہ ہمیں کیفی کی زندگی اور شاعری میں ملتا ہے۔ کیفی کی شاعری ایک طرح سے کمیونسٹ تحریک کے اتار چڑھاؤ سے وابستہ ہے اور اسی لیے وہ زندگی کی حقیقتوں کی آئینہ دار ہے۔

کیفی اعظمی فرقہ وارانہ فساد کے سخت مخالف ہیں۔ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''فرقہ وارانہ فسادات انسانیت کے لیے کوڑھ ہے۔ پھر بھی دنیا سے اس کا خاتمہ نہیں ہو سکا ہے۔ اسے ہر طرح سے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

ملک کے تقسیم جو مذہب کے نام پر ہوا اس کے متعلق کیفی صاحب فرماتے ہیں:

> .... مذہب کے نام پر ہمارے ملک ہندوستان و پاکستان کی تقسیم ہوئی تو ضرور تھی لیکن یہ بھی ثابت کر دیا گیا ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ مذہب کے نام پر زبان کے نام پر یا طبقوں کے نام پر یا سماج کے نام پر تقسیم بالکل ضروری

> نہیں ہے اور مذہب کے نام پر تو بالکل ضروری نہیں اور اس کے نتیجے اچھے نہیں ہوں گے۔ طبقوں کا جہاں تک سوال ہے اس میں تقسیم کا سوال ہی نہیں ہے۔ طبقے سوسائٹی نے پیدا کیے ہیں، ملکیت نے پیدا کیے ہیں اور وہ جب تک ہے طبقے رہیں گے۔ طبقوں کے مٹانے کا یا طبقوں سے نفرت ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ غیر طبقاتی سماج قائم ہو جائے اور وہ وہی سوشلزم میں ممکن ہے۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی کے یہاں انسان دوستی، بھائی چارہ اور عام انسانی برادری سے خلوص ومحبت بھرپور ملتا ہے۔ وہ ایک عالمگیر انسانی برادری کے علم بردار ہیں۔ اس لیے وہ کسی خاص ملک اور عقیدے کے پیرو نہیں ہیں وہ ہر اس عقیدے سے بیزار ہیں جو انسانی افکار کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے کیفی نے جو کچھ محسوس کیا اسے بڑے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ عملی طور پر کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں رہے لیکن نظریاتی لحاظ سے کمیونسٹ پارٹی سے ان کی گہری وابستگی رہی ہے۔ اشتراکی نظریے سے ان کی عقیدت اس قدر گہری اور بھرپور ہے کہ جب کمیونسٹ پارٹی میں شگاف پڑا تو وہ بے چین ہو گئے۔

مذہب:

یوں تو کیفی اعظمی شیعہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اسی خاندان

میں پیدا ہوئے اور پرورش پائی۔ اس لحاظ سے ان کا مذہب شیعہ ہے لیکن بحیثیت ایک دانشور اور شاعر مذہب کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ فرمایئے:

''یہ تو اگر قبر میں بھی مجھ سے پوچھا جائے تو وہاں بھی میں ٹال جاؤں گا۔ فرشتوں کو بھی اس کا جواب نہیں دوں گا۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

علالت:

۹ر فروری ۱۹۷۳ء کی رات میں ہاتھ پر فالج کا حملہ ہوا اور ہاتھ بے جان ہوگیا۔ برین ہیموریج کے بھی شکار ہوئے لیکن علاج سے انہیں دوبارہ زندگی مل گئی۔ ۱۹۷۸ء میں جبڑے کی ہڈی تین ٹکڑے ہوگئی۔ لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں تقریباً چار ماہ تک زیر علاج رہے اور ان کی ہڈی مکمل طور پر ٹھیک ہوگئی۔ ابھی حال میں پاکستان کا سفر کیا تو وہاں پیٹھ میں ایک پھوڑا نکل آیا۔ مگر وہاں کے ڈاکٹر اس کے آپریشن میں کامیاب نہیں ہوئے تو وہ فوراً اپنے ملک واپس ہوئے اور بمبئی کے ایک ڈاکٹر نے کامیاب آپریشن کر کے ان کی جان بچالی۔ کیفی صاحب اپنی موت وحیات کے متعلق مزید فرماتے ہیں:

''ویسے میں بہت ڈھیٹ ہوں۔ پتہ نہیں کیا مصلحت ہے۔ کئی حملے ایسے ہوئے ہیں جس میں باقاعدہ ریہرسل موت کی ہوگئی ہے۔'' (گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی اعظمی غضب کے ذہین ہیں اور ان کی یادداشت کا اندازہ لگانا آسان کام نہیں۔ ان کی یادداشت کا تو یہ عالم ہے کہ شاعری کے آغاز سے لے کر

اب تک انہوں نے جتنی بھی غزلیں اور نظمیں وغیرہ کہی ہیں وہ سب ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ آج تک کسی مشاعرے میں لکھ کر کچھ نہیں پڑھا۔ کیفی صاحب اردو کے علاوہ عربی اور فارسی اچھی جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی بھی کچھ جانتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی خود سیکھی ہے۔ باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں انگریزی کی تعلیم حاصل نہیں کی۔ کیفی صاحب کو لوگ جاہل سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں خود وہ فرماتے ہیں:

> ''میرے بارے میں تو یہ بھی مشہور ہے کہ ان پڑھ ہوں۔ کسی نے مجھے کاغذ لے کر پڑھتے دیکھا ہی نہیں۔ کبھی آج تک جتنے مشاعرے پڑھے سب زبانی ہی پڑھتا ہوں۔ لمبی لمبی نظمیں چھ چھ سات سات نظمیں سب زبانی پڑھتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ ''کبیر'' ہیں اپنے زمانے کے'' (گفتگو کا ریکارڈ)

''آخر شب'' کے بعد انہوں نے جتنی نظمیں کہیں وہ سب ان کے ذہن میں تھیں اور جو نظمیں انہیں پسند تھیں اس کا ایک مجموعہ تیار کروا کر ''آوارہ سجدے'' کے نام سے شائع کروا دیا۔ ''آوارہ سجدے'' اس وقت عالمِ وجود میں آیا جب کہ وہ برین ہیمرج جیسے خوفناک مرض سے چھٹکا پا چکے تھے۔ مگر ابھی ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اور لوگوں سے ملاقات کرنے پر پابندی لگا دی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق ایسے مرض میں یادداشت کو زیادہ خطرہ پہنچتا ہے مگر کیفی صاحب کی یادداشت غضب کی ہے کہ ایسے عالم میں بھی انہوں نے شمع

زیدی سے اپنی نظمیں وقتاً فوقتاً ڈکٹیٹ کرواکے شائع کروایا۔ ''آوارہ سجدے'' جب منظر عام پر آیا تو انہیں انعام ملا اور دشنام بھی۔

ذہنی طور پر کیفؔی اعظمی آج بھی اس ضعیفی اور کمزوری کے عالم میں ویسے ہی ہیں جیسے ایام شباب میں تھے۔ معذوری اور کمزوری لاکھ سہی مگر لکڑی کے علاوہ کسی اور کا سہارا لینا بالکل پسند نہیں کرتے پھر بھی رفیق حیات کے ساتھ کو اشد ضروری تسلیم کرتے ہیں۔ مصطفٰے کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا:

> ... ہاں اسوقت بڑھاپے میں جوانی سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے بیوی کی۔ کیونکہ جوانی میں تو بہت لوگ ساتھ ہوتے ہیں لیکن بڑھاپے میں یعنی پچاس کی عمر کے بعد انسان تنہا ہوجاتا ہے۔ اس وقت صرف بیوی ہی کچھ حصہ بٹا سکتی ہے''۔

(The Times of India. Sunday. January. 26. 1986. An Evening with Kaifi. By: K. Mustafa)

<u>ادبی سرمایہ</u>:

کیفی کی اب تک چار کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ ''جھنکار''، ''آخر شب''، ''آوارہ سجدے'' اور فلمی گیتوں کا مجموعہ ''میری آواز سنو'' اس کے علاوہ ایک نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئی ہے۔ ''آوارہ سجدے'' کے مجموعے پر انہیں کئی ایوارڈ مل چکے ہیں۔ جیسے ''ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ''، ''یوپی اردو اکادمی ایوارڈ''۔ اب اس وقت وہ اپنے تمام مجموعوں کی کلیات شائع کروانا چاہتے ہیں اور ایک ایپک لکھنے کا خیال ہے۔ اس کے

متعلق وہ فرماتے ہیں:

....اب میں اپنی صحت کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ کتنا حصہ بچا ہے ابھی عمر کا۔مگر ایک تمنا ''ایپک'' لکھنے کی ہے اس کے پہلے اگر مر گئے تو اپنے کو ناکام سمجھوں گا۔ایپک اردو میں نہیں لکھا گیا ہے۔ لکھا جانا چاہیے۔ میں اس کا خاکہ تیار کر چکا ہوں یعنی شروع کر دیا ہے کچھ لکھ چکا ہوں۔ظاہر ہے کہ وہ ابھی بڑا کام ہے۔اس کا موضوع بھی عجیب و غریب ہے۔آریہ شدید برف باری اور غذا کی نایابی کی وجہ سے کاکیکش سے اکھڑے اور وہ قافلے ادھر ادھر چلے گئے تو یہاں آکر انہوں نے سولائزیشن کو کیا دیا کیا لیا۔ یعنی تاریخی ہے۔آپ نے جو بھی شاعری میری دیکھی ہوگی اس میں تاریخی موضوع ہے۔ مجھے تاریخ بہت پسند ہے''۔(گفتگو کا ریکارڈ)

کیفی اعظمی کی شخصیت

شخصیت کی ابھی تک کوئی خاص مکمل تعریف نہیں کی جا سکی۔ شخصیت لیٹن لفظ پرسونا (Persona) سے بنا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے نقاب یا مکھوٹا (Mask) سب سے پہلے گریک آرٹسٹ نے اپنے کام کے مطابق تھیٹر میں منھ پر ایک مکھوٹا لگایا جس کو پرسونا کہا جاتا تھا۔ اس پرسونا سے شخصیت کا لفظ وجود میں آیا۔ ایک انسان کی شخصیت کے لیے خاص طور سے چار معنی بتائے گئے ہیں لیکن ان سبھی کی بنیاد پرسونا ہی ہے۔

ایک انسان حقیقت میں کیا نظر آتا ہے۔ اس کی شکل وصورت کیسی ہے؟ شخصیت کیسی ہے۔ دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو کس طرح ظاہر کرتا ہے جب کہ حقیقت میں وہ ویسا نہیں ہوتا یہ بھی شخصیت ہے۔ شخصیت ایک طرح کا رول (role) ہے جس کو انسان اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں طرح طرح سے انجام دیتا ہے جیسے تجارتی کام، سیاسی کام، مذہبی کام، معاشرتی کام اور خاندانی وگھریلو کام وغیرہ۔ ایک شخص کی اپنی پوری خصوصیات ہی شخصیت ہے ایک انسان کی

جسمانی اور دماغی دونوں خوبیاں شخصیت ہے۔

ایک انسان کی شخصیت کی تشکیل میں ماحول، خاندان، اسکول، کالج، دوست اور تعلیم یکساں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اندر سے ایک انسان کیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ بظاہر ایک انسان اپنے کام، اپنے اخلاق کے ذریعے دوسروں پر جیسا اثر ڈالتا ہے اس کے مطابق اس کی شخصیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے لیکن انسان حالات کے مطابق اپنے مزاج، ڈھنگ، برتاؤ اخلاقی رویئے کو بڑی حد تک تبدیل کرتا رہتا ہے ایسی صورت میں شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے۔

آج کے موجودہ دور میں سائنس اور سائیکلوجی نے ترقی تو کر لی ہے مگر شخصیت کی مکمل تعریف کرنے میں قاصر ہے۔ مگر پھر بھی کچھ خاص تعریفیں ایسی ہیں جو کسی حد تک شخصیت کو پرکھنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ بقول آل پورٹ (Allport):

> ''شخصیت ان تمام خصوصیات کی محرک ہے جو ذاتی طور پر ایک انسان کی اندرونی، دماغی، دلی اور جسمانی خصوصیات ہوتی ہیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر ایک انسان کی ذاتی چال چلن، برتاؤ، سلوک اور خیالات کو متعین کیا جاتا ہے''۔
>
> (بحوالہ ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ شرما، منووگیان کی پدھتیاں اور سدھانت، ص ۵۴۵)

آر۔بی۔کٹیل (R. B. Cattell) کے مطابق:

''شخصیت ایک ایسی چیز ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں ایک انسان کیا کرے گا''۔

(بحوالہ ڈاکٹر جے۔ڈی۔ شرما، منوِگیان کی پدھتیاں اور سدھانت، ص ۵۶۲)

سسرو نے شخصیت کے چار معنی بتائے ہیں:

''ایک انسان دوسروں کی نظر میں کیسا لگتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ویسا ہوتا نہیں۔ زندگی میں ایک انسان کیا کرتا ہے جیسے ایک فلاسفر، ایک انسان کی وہ سبھی خصوصیات جو کہ اس کو اس کے کام کو کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ ایک انسان کی اپنی الگ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں اس کا رتبہ مرتبہ شان وشوکت لکھنے کی اسٹائل''۔

(شخصیت व्यक्तित्व، بحوالہ رام بہاری سنگھ، تومر، ص ۲۰۳۔۲۰۴)

آل احمد سرورؔ تحریر فرماتے ہیں:

''شخصیت اس مجموعی، انوکھی، ممتاز اور منفرد خاصیت کا نام ہے جو وراثت اور ماحول کے ایک دوسرے پر پیہم کبھی مخالف اور کبھی موافق اثرات سے وجود میں آتی

ہے۔   (نظر اور نظریہ۔آل احمد سرور، ص۱۴)

بقول برگس(E. W. Burgess):

''شخصیت تمام خصوصیات کا مجموعہ ہے جو معاشرے میں انسان کی حیثیت اور کام کو متعین کرتی ہے۔ شخصیت کی تعریف اس طرح معاشرت میں اثرات قبول کرنے کی صورت میں کی جاسکتی ہے''۔

(بحوالہ رام بہاری سنگھ تومر، شخصیت व्यक्तित्व، ص۲۰۴)

سوئن(M. Schoeon) فرماتے ہیں:

''شخصیت ایک ایسی چیز ہے جو اپنی تمام خصوصیات اور تمام کاموں کی بناپر جیسے اپنی تمام عادتوں، برتاؤ اور عقل کی بناپر ایک انسان ذاتی طور پر اپنے ہی گروہ کے انسانوں سے الگ کیا جاسکتا ہے جو اپنے ہی گروہ کے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے''

(بحوالہ رام بہاری سنگھ تومر، شخصیت व्यक्तित्व، ص۲۰۶)

بقول آل احمد سرور:

''شخصیت زیادہ تر جسمانی خصوصیات سے بنتی ہے جو ورثے میں ملتی ہے لیکن شخصیت صرف موروثی،

جسمانی خصوصیات پر ماحول اور تربیت سے پڑتا ہے"۔(نظر اور نظریہ۔آل احمد سرور،ص ۱۲)

شخصیت کی تعمیر میں جسمانی خصوصیات کے بچپن کی تربیت کا اثر بچپن ہی سے پڑتا ہے۔سماجی رشتے اس پر مختلف طریقوں سے اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ کوئی بڑا واقعہ کوئی غیر معمولی شخص کوئی بڑی مذہبی سماجی یا سیاسی تحریک ذہن کو متاثر کر سکتی ہے اور تبدیل کر سکتی ہے۔

سائیکلوجسٹ ینگ (K. Young) نے شخصیت کو دو حصوں میں تقسم کیا ہے۔

(۱) ایکسٹروورزن (Extro Version)

(۲) انٹروورزن (Intro Version)

اکسٹروورزن انسان اندرونی دنیا کے مقابلے میں اپنی خارجی دنیا کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں اور انٹرورزن لوگ سیلف سینٹرڈ (Self Centred) ہوتے ہیں۔ایسے لوگ اپنی اندرونی دنیا کو خارجی دنیا کے مقابلے میں زیادہ ترجیح دیتے ہیں ینگ کے مطابق انسان کے اندر ایک پیدائشی قوت ہوتی ہے۔ یہ طاقت کوئی بھی رخ اختیار کر سکتی ہے۔یعنی اندرونی دنیا یا خارجی دنیا کی طرف اپنا رخ موڑ سکتی ہے۔

سائیکلوجسٹ ینگ نے ایکسٹروورزن اور انٹروورزن کے متعلق سب سے پہلے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''انٹروورزن ایک ایسی خاصیت ہے کہ یہ جس انسان

میں پائی جاتی ہے وہ سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتاہے اور فکر کرتا ہے۔اس کے برعکس ایکسٹروورزن ایک ایسی خاصیت ہے کہ وہ جس انسان میں ہوتی ہے وہ دوسروں کے متعلق یعنی قوم اور عوام کی بھلائی کے متعلق زیادہ سوچتاہے''۔

(بحوالہ البرٹ جیمس،چارٹ، ڈائل سائیکلوجی، ص ۴۱۷)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ انٹروورٹ شخصیت کے انسان اپنے ہی متعلق زیادہ سوچتے ہیں وہ دنیا کو اپنے خیالات، احساسات اور کاموں کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور سخت مزاج ہوتے ہیں۔اس کے برعکس ایکسٹروورٹ شخصیت کے لوگوں کا رجحان باہری دنیا کی طرف ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں میں زندگی کی قیمت سمجھتا ہے جو اس کے قریب آتا ہے وہ آسانی سے مختلف حالات میں اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور معاشرے سے پیار کرتا ہے۔ انٹروورٹ انسان اکسٹروورٹ کی بہ نسبت میوزک کو زیادہ پسند کرتا ہے اور ہنسی مذاق کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔اس کے علاوہ انٹروورٹ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے اور خواہشات ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے خیالات بہت اونچے ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا کام کرنے کے باوجود وہ احساس کمزوری کا شکار رہتے ہیں اور اپنے بڑے سے بڑے کام کو چھوٹا ہی سمجھتے ہیں۔لیکن انٹروورٹ شخصیت کے لوگ ایکسٹروورٹ کی بہ نسبت زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔

ایکسٹروورٹ اپنی مرضی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اپنی ہی مرضی کے مطابق سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جو کچھ سوچتے اور سمجھتے ہیں اسی لحاظ سے عمل بھی کرتے ہیں۔ انٹروورٹ کی بہ نسبت اپنے خیالات و مزاج کو جلدی جلدی تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اپنے آس پاس کے ماحول اور ہونے والی وارداتوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ سوشل ہوتے ہیں ینگ صاحب کے مطابق ایکسٹروورٹ شخصیت کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ " ایکسٹروورٹ انسان دنیا سے ہمدردی رکھتا ہے اور تنقیدی ڈھنگ سے اس کے بارے میں سوچتا ہے جس کی بنیاد سچائی پر ہوتی ہے۔ ایسا انسان اپنے کاموں اور خیالوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

۲۔ ایکسٹروورٹ انسان وہ ہوتا ہے جو باہر کے خیالوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور حالات کے مطابق کام کرتا ہے۔ معاشرے کے قانون کو نبھاتا ہے۔ وہ چاروں طرف کے لوگوں کے خیالات سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے اور اسی طرح کام کرنا چاہتا ہے۔ ینگ کا خیال ہے کہ اس طرح کی خصوصیات خواتین میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

۳۔ اکسٹروورٹڈ لوگ اپنے کام کو عمل میں لاتے ہیں وہ معاشرے کو جیسا دیکھتے ہیں ویسا ہی ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا کو خوش کرتے ہیں۔

۴۔ ایسے لوگ دنیا سے صرف اشارہ حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنے ڈھنگ سے کام کرتے ہیں"۔ (بحوالہ رام بہاری سنگھ تومر،

شخصیت، ص۲۴۱،۲۴۲)

ینگ کے مطابق ایکسٹروورٹ کی طرح انٹروورٹ شخصیت کی بھی چار حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

۱۔ پہلی طرح کی انٹروورٹڈ شخصیت دنیا کی طرف زیادہ نہیں دیکھتے۔ ایسے لوگ عمل بھی نہیں کرتے۔ کپڑے، روپے اور دوسری چیزوں کی طرف سے بھی لاپرواہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ خیالوں، قانونوں، آدرشوں کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں۔

۲۔ دوسری طرح کی انٹروورٹڈ شخصیت اپنے ہی کاموں اور خیالوں میں ڈوبے رہتے ہیں وہ دن میں خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ خاموش ہوتے ہیں اور دنیا سے بالکل دور۔

۳۔ تیسری طرح کے انٹروورٹڈ لوگ ہر چیز کو اپنے ہی نظریے سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے ہی نفس کو اہمیت دیتے ہیں۔

۴۔ چوتھی طرح کے انٹروورٹڈ لوگ اپنی اندرونی دنیا کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے اشارے حاصل کرتے ہیں اور اپنے آپ ہی میں رہتے ہیں۔ دوسروں کی فکر نہیں کرتے۔ مذہبی لوگ، درویش، آرٹسٹ، سنکی اسی میں آتے ہیں''۔

(بحوالہ رام بہاری سنگھ تومر، شخصیت، ص۲۴۲)

اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو ایک انسان میں ایکسٹروورٹ اور انٹروورٹ دونوں کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔ یعنی ایک انسان ایکسٹروورٹ

اور انٹرو ورٹ دونوں ہوتا ہے اور یہ دونوں خصوصیات ایک انسان میں ایک ہی وقت میں پائی جاتی ہیں۔ ان دونوں خصوصیات میں سے جو زیادہ طاقتور ہوتی ہے وہ دوسری خصوصیات پر فتح پالیتی ہے جو ذہن میں موجود رہتی ہے اور انسان کا برتاؤ اسی کے مطابق ہوتا ہے۔ دوسری خصوصیات جو ذہن میں دب جاتی ہیں۔ وہ بھی ذہن میں دبی پڑی رہتی ہیں ختم نہیں ہوتیں۔ مثلاً اگر کوئی انسان ایکسٹروورٹ ہے تو ناواقفیت میں وہ انٹروورٹ بھی ہوگا۔ اگر جانکاری اور واقفیت میں انٹروورٹ ہے تو وہ ناواقفیت میں ایکسٹروورٹ ہوگا۔

محولہ بالا کی تمام تشریحات اور تعریفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم کیفی اعظمی کی شخصیت پر غور کریں تو اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت ایک ایکسٹرورٹ انسان کی ہے۔ ایک ایکسٹروورٹ انسان ہی اچھا سیاست داں ہوسکتا ہے کیونکہ ایک انٹروورٹ کے برعکس وہ دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچتا ہے اور آس پاس کی واردات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اور معاشرے سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کام اور جس چیز کے بارے میں وہ سوچتا ہے اسے عمل میں بھی لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک سیاست داں انسان میں ان تمام خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ ایک اچھے لیڈر میں جو خصوصیات ہونی چاہیے وہ تمام خصوصیات کیفؔی اعظمی صاحب میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے سیاسی اور معاشرتی جدوجہد میں کامیاب رہے ہیں۔

کیفؔی اعظمی کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ ایکسٹروورٹ شخصیت کے مالک ہیں کیونکہ ان کے یہاں

معاشرے سے ہم آہنگی، جذبات پر قدرت، صبر و استقلال، برداشت کا مادہ، پریشانیوں اور مصیبتوں کا بہادری سے مقابلہ اور کبھی بھی کسی مشکل میں ہار نہ ماننا، ان کی شخصیت کا خاص وصف ہے جو ایک ایکسٹروورٹ انسان کے اندر ہوتی ہے۔ اگر کیفی صاحب انٹروورٹ ہوتے تو وہ بھی خارجی دنیا سے انحراف کرتے اپنی اندرونی دنیا کو خارجی دنیا پر ترجیح دیتے اور معاشرے اور سیاست سے دور رہنا پسند کرتے۔ کیفی صاحب فراقؔ کی طرح صرف سوچتے اور محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ عمل کرتے ہیں چاہے ان کا ذاتی معاملہ ہو یا قومی و ملکی معاملہ ہو۔

میرے خیال میں کیفی اعظمی کی شخصیت ایکسٹرودرٹ اور انٹروورٹ دونوں خصوصیات کی حامل ہے۔ کیونکہ میں نے ان کے حالات زندگی کا جس حد تک مطالعہ کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی اندرونی اور باہری دنیا کو اہمیت دی ہے۔ کسی طرف سے بے نیازی نہیں برتی، چاہے ان کی اپنی خاندانی اور گھریلو زندگی ہو یا معاشرتی و سیاسی زندگی۔ زندگی کے ہر پہلو کو انہوں نے اہمیت دی ہے۔ اگر دوسری طرف غور کیا جائے تو ان کی اپنی ذاتی زندگی کے آرام اور تکلیف کی فکر کا جہاں تک سوال ہے تو یہ حقیقت ہے کہ ذاتی طور پر ان کو اپنی فکر کبھی نہیں رہی۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی فکر زیادہ کی، تو اس بنیاد پر کیفی صاحب کو ایکسٹرودرٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اپنے گھر خاندان اور معاشرے سے لگاؤ اور ہمدردی کے علاوہ سیاست سے کیفی صاحب کا تعلق کسی حد تک رہا او رہے۔ وہ عملی طور پر کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں رہے لیکن نظریاتی لحاظ سے کمیونسٹ پارٹی سے ان کی وابستگی گہری رہی ہے اور ہے۔ اشتراکی نظریے سے

ان کی عقیدت اس قدر گہری اور بھرپور ہے کہ جب کمیونسٹ پارٹی میں شگاف پڑا تو وہ بے چین ہو گئے۔

کیفیؔ صاحب ایک عالم گیر انسانی برادری کے علم بردار ہیں اس لیے وہ کسی خاص ملک اور عقیدے سے بیزار ہیں جو انسانی افکار کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔ کیفیؔ قوم پرست اور رحم دل انسان ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ کیفیؔ صاحب کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت ایک ایکسٹرو ورٹ انسان کی شخصیت ہے جو اکثر شعرا کی نہیں ہوتی۔

کیفی اعظمی کی ابتدائی شاعری اور نظم نگاری کا بتدریج ارتقا

اگر اردو نظم کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو نظم کے خدوخال سترہویں صدی میں ہی ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔ شمالی ہند میں بزرگوں اور صوفیوں نے نظم گوئی کو فروغ دینے میں بڑا کام کیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ان کے ذہن میں شعوری طور پر نظم کو فروغ دینے کا خیال نہ رہا ہو۔ بلکہ کسی مقصد کے حصول کے تحت انہوں نے شاعری کی ہو اور اس ہیئت کو اپنایا ہو۔ شرف الدین یحیٰی اور شیخ عبدالقدوس جیسے بزرگوں کی خدمات اس سلسلے میں کافی اہم ہیں۔ دکن اور گجرات کا تمام ادبی اثاثہ شاعری کی بیانیہ صنف کی شکل میں موجود ہے۔ گولکنڈہ کے قلی قطب شاہ کا کچھ کلام خود ایسا ہے جسے نظم کے علاوہ اور کوئی نام دے ہی نہیں سکتے۔ شبِ برات، بسنت، عید کے علاوہ اپنی محبوباؤں اور پیاریوں کے حسن و جمال کی داستان اور ان کے بناؤ سنگار، رنگ و روپ کا بیان نظم ہی کی

شکل میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔

دہلی میں نظم کی ابتدا ایک فحش نگار جعفر زٹلی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری کے ابتدائی دور میں صدرالدین فائز اور شاہ حاتم وغیرہ نے مثنوی کی صنف اور صورت اختیار کر کے فلسفیانہ اور مفکرانہ بیانیہ شاعری کے نمونے پیش کیے۔ شاہ آبرو کی نظم ''موعظت آرائش معشوق'' بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو دہلی کی جنسی اور اخلاقی گراوٹ کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے بعد میر و سودا کے زمانے میں اردو شاعری نے ہر لحاظ سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ ان کے قصیدے شہر آشوب، مثنوی اور قطعات وغیرہ میں بھی نظم نگاری کے جراثیم موجود ہیں۔ بہرحال اس بنیاد پر اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ شعرائے متقدمین میں بھی نظم کا رجحان موجود تھا۔ اس کے علاوہ نظیر اکبرآبادی نے عشق، مذہب، موسم، تیوہار، افلاس اور امارت وغیرہ پر کامیاب نظمیں لکھی ہیں جو موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ ان کی خود اپنی ذات اور اس کے عہد کی ترجمان ہوتے ہوئے نظم کی ہیئت میں بھی پوری اترتی ہیں۔ نظیر کے بعد نظم کی اس روایت کو آگے بڑھانے والا کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا۔ مشکل سے انشاء اللہ خاں انشا کی ایک آدھ غزلیں اور غالب کی ''چکنی ڈلی'' اور ''آم'' نظمیں کہلا سکتی ہیں۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''اردو شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر ۱۸۵۷ء
> اور اس کے کچھ دنوں بعد تک ہمارے یہاں غزل سب
> سے زیادہ پسندیدہ ذریعۂ اظہار رہی ہے۔ لیکن نظم نگاری

کی بھی کچھ نہ کچھ صورتیں رائج رہی ہیں۔قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ہجو، شہرِ آشوب اور اس طرح کی دوسری اصنافِ نظم ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔اس طرح غزل مسلسل، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مسدس وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نظم کی بعض ہیئتوں کی نشاندہی کرتی ہیں۔'' (نئی نظم کا سفر، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۴)

اردو شاعری میں غزل کے علاوہ جو دوسری اصناف رائج ہوئیں ان کو جدید معنوں میں نظم کہنا تو دشوار ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ انہیں نظم کی بنیادی خصوصیات یعنی خارجی زندگی سے ارتباط اور اس کی تصویر کشی ہر دور میں موجود رہی۔اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا فرماتے ہیں کہ:

''دکنی نظم عام طور سے مثنوی، قصیدے اور مرثیے کے روپ میں ابھری، بے شک ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ اصناف ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ تاہم خارجی اشیا اور واقعات مس کرنے کے باعث یہ اصناف نظم کے زمرے ہی میں شامل ہو جاتی ہے۔'' (اردو شاعری کا مزاج، ڈاکٹر وزیر آغا، ص ۳۶۳)

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد سماجی اور معاشی نظام میں تبدیلیاں آئیں۔صدیوں کا بوسیدہ جاگیرداری نظام ختم ہوا۔اس کی جگہ ایک دوسرے جاگیرداری نظام نے لے لی۔لیکن اس نظام نے عوام کی اہمیت کو کسی حد تک

محسوس ضرور کیا اور عوام کے ذہنوں میں بیداری کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ حالات نے نئے طبقات کی تشکیل کی تھی جس کے زیر اثر تصورِ حیات بدل گیا تھا۔ افکار و خیالات میں انقلاب آئے۔ زندگی کا ہر شعبہ تبدیلیوں سے ہمکنار تھا۔ بدلتے ہوئے حالات نے اس زمانے کے ادب کو بھی متاثر کیا۔ ادب و شعر کے بنیادی تصورات بدل گئے۔ ادب کی ہر صنف نئے راستے پر گامزن ہوئی۔ شاعری پر بھی ان حالات کا اثر ہوا۔ اس ماحول میں حالؔی اور آزادؔ جیسی اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں جس نے شعوری طور پر شاعری کو بدلتے ہوئے ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۷ء میں انجمنِ پنجاب لاہور کی سرکردگی میں آزادؔ اور حالؔی نے نئی نظم نگاری کی طرح ڈالی جس کی تردید ڈاکٹر عبادت بریلوی کے اس قول سے ہوتی ہے:

> ''انجمن پنجاب کے مشاعروں کی یہ خصوصیت تھی کہ انہیں مصرعۂ طرح کی بجائے نظموں کے عنوانات دیے جاتے تھے''۔ (جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص۱۴)

اردو نظموں کا جدید تصور بحیثیت ایک صنفِ سخن کے مغربی ادبیات کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ قدیم ذخیرۂ شاعری میں بھی اکثر بعض مذہبی یا عشقیہ مثنویاں ملتی ہیں جن کے بعض ٹکڑے مربوط و مسلسل نظموں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں لیکن ان تمام حقائق کے باوجود یہ ایک تاریخی امر ہے کہ جدید نظم طرزِ مغرب سے متاثر ہو کر اور اس کے تتبع میں ایک خاص طرز

شاعری مروّج کرنے کی کوشش کے نتیجے کے طور پر مرکزی حیثیت حاصل کرسکی۔ بے شک نظم کا جدید تصور مغربی اثرات کا مرہونِ منت ہے۔

اگر اردو نظم کے قدیم وجدید سرمایہ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نظم کا دامن ابتدا ہی سے رنگا رنگ اور متنوع مضامین سے مالا مال تھا۔ مناظرِ قدرت کا بیان، مختلف موسموں، تیوہاروں، پرندوں اور عمارات کا ذکر تاریخی واقعات، حسن وعشق کی چھیڑ چھاڑ، اخلاقی ومذہبی موضوعات، سماجی، سیاسی، قومی ومعاشی مسائل، فلسفیانہ رموز ونکات، غرض حیات وکائنات کے کم وبیش سبھی گوشوں کو اردو نظم نے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نظم کا ارتقا بھی بتدریج ہوا ہے جیسے جیسے سماجی شعور نے ترقی کی اسی طرح نظم کے مضامین میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ شعروادب میں اچانک تبدیلی کا عمل نہیں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا آزادؔ اور حالیؔ بھی قدیم روایت سے ایک دم انحراف نہیں کرسکے۔ اس کی تصدیق خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس اقتباس سے ہوتی ہے:

> ''شعروادب میں تبدیلی کا عمل اچانک نہیں ہوتا۔ مزاج کی تبدیلی اور نئے سانچے کی تشکیل میں مدتیں لگ جاتی ہیں چنانچہ آزادؔ اور حالیؔ کی نظم نگاری، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، ترکیب بند، مسدس اور مخمس کے پرانے سانچوں سے انحراف نہیں کرتی۔'' (نئی نظم کا سفر، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۶)

حالیؔ، اکبرؔ اور شبلیؔ کا زمانہ اردو شاعری میں نظم نگاری کا بہترین زمانہ

ہے۔ان شعرا نے نظم کے معیار اور موضوع کو اتنا وسیع اور بلند کر دیا کہ اس میں زندگی کے تمام مسائل جگہ پانے لگے۔ان کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے ملکی اور قومی خصوصیات کو اپنی نظم کا موضوع بنایا۔ان کے فوراً بعد آنے والی نسلوں میں ظفؔر علی خاں، چکبسؔت، سرورؔ جہاں آبادی، تلوک چند وغیرہ اور دوسرے شعرا نے بھی وطن اور قومی آزادی جیسے پسندیدہ موضوعات پر نظم لکھتے رہے۔لیکن ان کی نظمیں سانچوں اور اسالیب کے اعتبار سے پرانے طریقوں کے مطابق ہی رہیں۔ان کے بعد نظم طباطبائی نے پابند نظم میں پہلی بار تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ گورِ غریباں کے عنوان سے نظم لکھی جو ترکیب بند، ترجیع بند، یا مخمس و مسدس کے بند سے مختلف ہے۔اسی طرح شرؔر نے اردو میں معریٰ اور آزاد نظم رائج کرنے کی کوشش کی۔اس کے علاوہ بعض تبدیلیاں مغربی نظموں کے تراجم سے بھی وجود میں آئیں۔محمد حسین آزاد سے لے کر ظفر علی خاں، عزیز لکھنوی، حسرت موہانی، غلام بھیک، سرور جہان آبادی، تلوک چند محروم، پنڈت دتا تریہ کیفی، غرض یہ کہ تقریباً ہر شاعر نے ترجمے میں طبع آزمائی کی ہے۔

اقباؔل نے جدید نظم نگاری کی تشکیل میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔اقباؔل کی نظم نگاری حاؔلی، شبؔلی، اکبؔر سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ان کے علاوہ اور دوسرے شعرا مثلاً ظفر علی خاں، چکبسؔت، سرورؔ جہان آبادی وغیرہ اقباؔل سے بہت پیچھے رہے۔کیونکہ ان پر یا تو انیؔس کا پرتو ہے یا حاؔلی و شبلی کا اثر ہے۔اقباؔل کی قومی شاعری کو بعض شعرا نے اپنے فن کا محور بنایا۔جن میں حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، روش صدیقی، جوش ملیح آبادی، احساؔن دانش اور اختر شیرانی وغیرہ کا نام

بھی لیا جاسکتا ہے۔ اگر چہ ان میں سے اختؔر شیرانی کے علاوہ کسی اور شاعر کو بہ حیثیت شاعر کوئی نمایاں جگہ نہیں مل سکی۔

ترقی پسند شاعروں میں مجازؔ، جاں نثارؔ اختر، سردار جعفری، کیفؔی اعظمی اور دوسرے بہت سے شعرا کو جوشؔ کے اثر نے خاصا نقصان پہنچایا۔ ان کی نظمیہ شاعری کے انفرادی جوہر کو پنپنے کا کم موقع ملا۔ غالباً مخدوؔم پہلے ترقی پسند شاعر ہیں جنھوں نے آزاد نظم لکھنے کی جرأت کی۔ ورنہ اس وقت تک آزاد نظم کو زوال پسندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جعفری نے اپنی ابتدائی نظموں میں کہیں کہیں اقبالؔ سے اثر قبول کیا تھا لیکن خطیبانہ مزاج انہیں بھی جوشؔ ہی کی طرف لے گیا۔ اس کے علاوہ اردو نظم کو قصیدہ، مرثیہ، قطعہ اور غزلِ مسلسل کے فرسودہ سانچوں اور اس کی گھسی پٹی لفظیات اور امیجری سے آزاد کر کے ایک نیا آہنگ اور اسے نئے ذائقوں سے روشناس کرانے کا سہرا ن۔ م۔ راشد اور میراؔجی کے سر ہے۔ اگر چہ اس سلسلے میں تصدق حسین خالدؔ اور ڈاکٹر تاثیر نے بعض ابتدائی کوششیں کی تھیں لیکن خالدؔ اور تاثیؔر کے یہاں داخلی تجربے کی کمی اور تخلیقی شدت کے فقدان کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی نظمیں نئے ذہن کے نفسیاتی اور جذباتی تقاضوں کو آسودہ نہیں کر پائیں۔

عشقیہ شاعری کا جہاں تک تعلق ہے سب سے پہلے جوشؔ کے یہاں عورت کے حسن و شباب کا احساس سب سے نمایاں ہے۔ جوشؔ کے ساتھ ساتھ ساغرؔ نظامی، حفیظ جالندھری، اخترؔ شیرانی، روش صدیقی وغیرہ نے بھی اس طرف توجہ کی۔ یہ سب لوگ جوش کی سی حقیقت نگاری سے ہم آہنگ عشقیہ شاعری

کرنے میں کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن پھر بھی انہوں نے اس رجحان کے لیے بہت کچھ کیا۔ خصوصاً خارجی حسن کی ترجمانی میں پوری کوشش کی۔ عشقیہ حقیقت نگاری کے اس رجحان کو نئے نئے رنگوں سے آراستہ پیراستہ کرنے میں دو نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ عظمت اللہ خاں اور اختؔر شیرانی۔ اختؔر کی ساری شاعری میں رومان ہی رومان ہے لیکن اس رومان کو بھی انہوں نے حقیقت کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اختؔر کی شاعری کا یہی سب سے بڑا کمال ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں یہ رجحان کم وبیش ۱۹۳۵ء یا اس کے بھی چند سال بعد تک چلتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ لیکن ۳۵ء کے لگ بھگ نئی پود کے بعض ایسے شاعروں کا وجود ہوا جو اس منزل سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان میں اکثر کے یہاں سماجی شعور موجود تھا۔ زندگی کے نظام واقدار کی ناہمواری نے کیف پرور کی دنیا سے نکال کر حقیقتوں کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں چھوڑ دیا۔ اس ماحول میں وہ عشق کا دم کیسے بھرتے۔ انہوں نے ان کیفیات کا بیان کیا جو حالات کی موج خوں سر سے گزر جانے کے باعث ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھیں۔ اردو شاعری عشق کے ایک ایسے تصور سے روشناس ہوئی جس کی خصوصیت بدلے ہوئے ماحول اور بڑھتے ہوئے سماجی شعور سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ یہ رجحان یوں تو کم وبیش تمام شاعروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے علمبرداروں میں مجازؔ، فیضؔ، تاثیرؔ، راشدؔ، ندیم قاسمؔی، سردارؔ جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختؔر، کیفؔی اعظمی، اختر الایمان، ساحرؔ لدھیانوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو شاعری میں عشقیہ رجحانات کے ساتھ ساتھ سماجی اجتماعی رجحان کی ابتدا بھی ۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی سے ہوئی۔ اس سے قبل اس کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ ۵۷ء کے انقلاب کے بعد زندگی کو اجتماعی عینک سے دیکھا جانے لگا۔ کیونکہ حالات نے بہت سے اجتماعی مسائل پیدا کر دیے تھے۔ سماجی زندگی کے ان مسائل نے اردو شاعروں کے اندر بھی اجتماعی شعور کی شمع روشن کی۔ حالؔی اور شبلؔی کی اصلاحی اور سیاسی نظمیں اس احساس کی پیداوار ہیں۔ ان کے علاوہ اکبرؔ الٰہ آبادی کے یہاں بھی باوجود اس کی مروجہ ہیئت کے ایک اجتماعی شعور دکھائی دیتا ہے۔ اس رجحان کو اور آگے بڑھانے والوں میں چکبستؔ، اقبالؔ، سردار جہان آبادی وغیرہ پیش پیش تھے۔ چکبستؔ نے اس وقت اپنی شاعری میں سیاسی روح کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ وطنیت ان کا خاص موضوع ہے۔ اقبالؔ کے یہاں یہ سیاسی رجحان اپنے ہم عصروں کے بالمقابل ذرا بدلی ہوئی شکل میں ملتے ہیں۔ اس لیے اقبالؔ ان سب میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کے اثرات اردو شاعری پر بہت گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ شائد ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو اقبالؔ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جوشؔ تک پر ان کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ ہر چند کہ جوشؔ کے افکار و خیالات اور عقائد و نظریات اقبالؔ سے مختلف ہیں لیکن جوشؔ نے اپنے افکار و خیالات کی تشکیل میں اقبالؔ سے سب کچھ حاصل کیا ہے۔

اقبالؔ اور جوشؔ کے اثرات بالکل نوجوان شاعروں پر بہت زیادہ ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اقبالؔ اور جوشؔ نے اردو شاعری میں ایک ایسی زمین تیار کی جس میں ترقی پسند شاعری کا بیج پھوٹا۔ غرض یہ کہ:

"اردو نظم کے فنی ارتقاء کا اگر دیدہ ریزی کے ساتھ
مطالعہ کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ نظم نگاری کی
روایت اگرچہ یہاں بہت پرانی ہے لیکن فنی اعتبار سے
۱۹۳۶ کے بعد کا دور ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی
مغرب کے اثر سے نظم کے سانچوں اور اس کے اسالیب
میں شکست وریخت کا عمل شروع ہوگیا تھا لیکن ان کو تخلیقی
توانائی ۱۹۳۶ء کے بعد والے دور میں نصیب ہوئی"۔
(نئی نظم کا سفر، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۴)

غرض یہ کہ اردو نظم بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے ۳۶ء کے بعد اپنی
پوری تخلیقی توانائی کے ساتھ سامنے آئی۔ اس میں حصہ لینے والے اہم شاعروں
میں مجازؔ، فیضؔ، جعفریؔ، ساحرؔ، جاں نثار اخترؔ، مخدوم، جذبیؔ، وامقؔ، کیفیؔ اعظمی
وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

کیفیؔ اعظمی کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ کیفیؔ
کی شاعری قومیت اور آزادی کا دھندلا یا جذباتی تصور نہیں رکھتی بلکہ واضح طور پر
ایسا انقلاب چاہتی ہے جس میں ہندوستان آزاد ہو اور جمہوری نظام قائم ہو۔
ہر فرد کو خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے، رنگ و نسل کی تمیز مٹ جائے۔

کیفیؔ کی شاعری ان کی ذات اور ان کے عصری عہد دونوں کا پتہ دیتی
ہے۔ حسرت ناک یادوں کے بجائے زبردستوں کے مصائب، غیروں کے ستم،

اپنوں کی سازش، بیکسوں کی اشک ریزی، ناتوانوں کی بے بسی، کسانوں کی فاقہ کشی، مزدوروں کی حق تلفی، غریبوں کے خون کی ارزانی، حق وصداقت کی زبان بندی، فکر وخیال کی آزادی پر حملے جوانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں پر سماج کے پہرے، عام لوگوں کی بے کیف و بے رنگ زندگی ان کے بے سود و تجسس وغیرہ کا احساس کیفی کی شاعری میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

اپنے ہم وطنوں کی زبوں حالی اور شکست دلی کی ترجمانی کے باوجود کیفی نے اپنی شاعری میں شکست خوردہ ذہنیت کو ہرگز راہ نہیں دی۔ ان کے یہاں شکست خوردہ ذہنیت کے بجائے رجائیت شروع سے موجود ہے۔ ناسازگار حالات کو بدلنے کے حوصلے کا اظہار ان کی نظموں میں بخوبی ملتا ہے۔ جیسے ''بیوہ کی خودکشی''، جوہر آندھی، آخری جنگ، موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر، آخری مرحلہ وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کیفی چونکہ حساس دل کے ساتھ بیدار ذہن بھی رکھتے ہیں اس لیے دنیا کے دکھ درد کی طرف ان کا رویہ وہ نہیں جو ذاتی ذہنیت رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔

کیفی نے ایک حساس اور باغی نوجوان کی حیثیت سے اپنے زمانے کے سرکش اور باغی نوجوانوں کے افکار اور خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مصلح تنازعوں میں جو ملک گیر پیمانے پر ہوتے ہیں بہت بڑے پیمانے پر تباہی اور بربادی بھی آتی ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے۔ جھونپڑوں اور محلوں میں آگ لگتی ہے۔ کھیت و کھلیان اجڑتے ہیں۔ گھر سے لے کر میخانے تک انسانی سکون کے مراکز خون کی ندیوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس حقیقت

کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انقلاب کن لوگوں کے ہاتھوں اور کس طرح وجود میں آتا ہے۔ اس کی آمد کے سلسلے میں برسر اقتدار سیاسی طبقہ کے خلاف مسلح بغاوت کتنے خون خرابے کا باعث بنتی ہے۔ ان تمام امور کے سلسلے میں کیفیؔ کا تصور وہی ہے جو اس زمانے میں ایک خاص انداز سے سوچنے والے نوجوانوں اور کمیونسٹ پارٹیوں کا تھا۔

لہٰذا کیفیؔ کی شاعری میں مزدوروں کی مصیبتوں، درمیانی طبقے کی چھوٹی چھوٹی ناکامیاں اور نامرادیاں، عورت کی بے بسی اور مظلومیت، انسان کی تذلیل، چھوٹے بڑے کی تفریق، ظلم کی دراز دستی، معاشی تنگیوں، سیاسی بدعنوانیوں اور جذباتی ناآسودگیوں کا ذکر کیفیؔ کی شاعری کا محور و مرکز ہے۔ غرض یہ کہ رومانی، انقلابی، اشتراکی شاعری کے لحاظ سے کیفیؔ کی نظمیں اپنے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

کیفیؔ سے قبل حالیؔ، اکبرالہ آبادی، شبلیؔ، چکبستؔ، جوشؔ، اختر شیرانی، احسانؔ دانش وغیرہ کے یہاں بھی رومانی اور انقلابی نظمیں ملتی ہیں۔ کیفیؔ نے ان شاعروں کے اثرات ضرور قبول کیے اور اپنے تمام ہم عصر شاعروں کی طرح رومانی اور انقلابی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ اپنے سے پیشتر کے تمام شاعروں کے برعکس کیفیؔ کی رومانی اور انقلابی شاعری میں جدیدیت اور حقیقت پسندی کا رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ کیفیؔ کی شاعری اسلوب اور طریق کار اور مزاج کے اعتبار سے، موضوع کی خصوصیت کے اعتبار سے ان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ابتدائی دور کی دوسری نظموں میں یعنی ان کے پہلے مجموعہ

''جھنکار'' اور آخرِ شب میں سطحیت زیادہ اور گہرائی کم نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے کیفی کا شعور پختہ ہوتا گیا ویسے ویسے ان کے کلام میں بھی گہرائی اور پختگی آنے لگی۔ جس کی بہترین مثال ان کے تیسرے مجموعۂ کلام ''آوارہ سجدے'' کی نظمیں ہیں۔ کیفی کے تصورِ انقلاب میں جوشؔ کی طرح تخریبی عنصر نظر نہیں آتا۔ اگر کہیں نظر بھی آتا ہے تو بہتر اور پُرسکون مستقبل کی امیدیں۔ کیفی ایسی تخریبی توڑ پھوڑ اور خونریزی کا استقبال کرتے ہیں جس کے بعد انسان خوش گوار زندگی گزار سکے۔ اس طرح کیفی کی ابتدائی شاعری پر رومانیت کا غلبہ صاف نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی پوری شاعری پر رومانیت حاوی نہیں نظر آتی۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ کیفی کی رومانی اور انقلابی نظمیں اپنے سے پیشتر شعرا سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔ اس میں سچی ترقی پسندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا خیال اور نصب العین صاف اور حسین طرزِ بیان سیدھا اور براہ راست، اشتراکیت کے پرجوش حامی ہیں۔ اقبالؔ کی طرح اپنے ہم وطنوں کو بھی جہد وعمل کا پُرجوش پیام دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کیفی اردو کی انقلابی شاعری کی مثال لیتے ہوئے ترقی پسندوں کے روز افزوں کارواں میں آگے چلنے والی حقیقت ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں کیفی نے جوشؔ اور میر انیسؔ کے اثرات قبول کیے۔ جس کے نمونے ان کے پہلے اور دوسرے مجموعۂ کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مَنّتیں، سویرے سویرے۔ برسات کی ایک رات، بانسری کا لہرا، جو فطرت نگاری کا بہترین نمونہ ہیں ان میں جوشؔ کے رومانی

اثرات صاف نمایاں ہیں۔ کیفؔی کی انقلابی شاعری میں جوشؔ کے اثرات کا جہاں تک سوال ہے تو بس اتنا کہ شائد وہ محض جوشؔ کے لفظ انقلاب سے متاثر ہوئے ہوں گے۔ کیفؔی کی انقلابی شاعری پر جوشؔ کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ جوشؔ کے یہاں ابتدا سے آخر تک انقلاب کا تصور بہت ہی ہولناک ہے۔ ان کو محض تخریب سے مطلب ہے کیونکہ بغاوت ان کی فطرت ہے۔ بغاوت کو تخریب سے تسکین ہوتی ہے۔ اس لیے جوشؔ بغاوت کا خیال آتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ تخریب کا مستقبل میں انجام کیا ہوگا؟ اچھا یا بُرا اس کا خیال جوشؔ کے یہاں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ کیفؔی کے انقلابی تصورات میں ابتدا ہی سے کسی قسم کی ہولناکی، توڑ پھوڑ یا تخریب کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔

کیفؔی اول تو تخریب کا تصور ہی اپنے ذہن میں آنے نہیں دیتے لیکن جب جب کہیں انہیں تخریب میں تعمیر کا پہلو نظر آیا ہے وہ ایک دم اپنے ساتھ عوام کو بھی بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں۔ جوشؔ کے برعکس کیفؔی کی نظر ہمیشہ مستقبل پر رہتی ہے۔ کسی بات کا انجام سوچ کر ہی وہ قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کیفؔی کی ابتدائی دور کی رومانی نظموں پر جوش کے اثرات رہے لیکن جلد ہی وہ ان اثرات سے باہر نکل آئے۔

کیفؔی کی شاعری پر میر انیسؔ کے اثرات کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

”کیفؔی کے اسلوبِ بیان میں انیسؔ کے مرثیوں کی روایات کے بہت سے عناصر جذب ہو گئے ہیں۔ جن کی

وجہ سے ان کی آواز پھٹ کر بکھر نہیں جاتی بلکہ فصاحت
اور روانی باقی رہتی ہے'' (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،
خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۲۸)

منجمد خون میں شعلے سے تپاں ہیں دیکھو
افقِ دار سے لاشیں نگراں ہیں دیکھو

اس میں کوئی شک نہیں کہ کیفیؔ کی ابتدائی شاعری پر میر انیسؔ کے اثرات نہ پڑے ہوں لیکن یہاں بھی انیسؔ کی اس روایت سے بھی بہت جلد دامن بچا کر الگ ہوگئے اور حقیقت پسند جدید روایت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

شروع سے آخر تک کی کیفی کی تمام نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیفیؔ نے جن تجربات کے تحت نظمیں لکھی ہیں وہ ان کے اپنے ذاتی تجربات ہیں جنہیں انہوں نے شعری قالب عطا کیا۔ کیفیؔ کی نظر شروع سے یعنی بچپن ہی سے مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور مظلوموں پر رہی ہے۔ ان کے بیچ رہ کر کیفیؔ نے جو تجربات حاصل کیے وہی ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ کیفیؔ اخبار کی سرخی دیکھ کر نظمیں لکھتے ہیں۔

ایک خاص نظامِ فکر سے وابستگی اس سے حاصل ہونے والی محرومی مسلسل غور وفکر کی عادت فطری خلاقی اور شدتِ احساس نے مل جل کر کیفیؔ کی نظموں میں ایسی ایسی تخلیقی پرتیں پیدا کر دی ہیں کہ ان پہلودار تخلیقات کو پڑھتے ہوئے بار بار نئے امکانات کے در وا ہوتے ہیں اور نئی جہتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ کیفیؔ کی دورِ اوّل کی نظمیں غنائیہ اور رومانی ہیں۔ دوسرے دور کی نظمیں بیانیہ اور خارجی

شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ دورِ سوم کی زیرِ بحث نظمیں غنائیہ اور بیانیہ کا حسین امتزاج، داخلیت اور خارجیت کا خوبصورت آمیزہ ہیں۔ یہ چیزیں پیچ در پیچ، دائرہ در دائرہ کیفیات کے ساتھ اپنے مختلف رنگ لے کر نظموں میں منعکس ہوتی ہیں۔ جن کی مثالیں ترقی پسند شاعری میں کمیاب ہیں۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ ''جھنکار'' اور ''آخرِ شب'' کی تمام نظمیں پابند ہیں لیکن ان میں ہیئت کے گوناگوں تجربات سے ندرت پیدا کی گئی ہے۔ ''آوارہ سجدے'' میں بمشکل آٹھ نو آزاد نظمیں نظر آتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد نظم کی ہیئت کو بھی کیفؔی نے کافی غور و فکر کے بعد قبول کیا ہے۔ فیضؔ احمد فیضؔ نے بجا فرمایا ہے کہ:

> جیسی سفاک اور بے رحم زندگی ہمارے گرد و پیش موجود ہے اس کے بے کم و کاست منظر کشی کیفؔی کا مسلک شعر ہے۔ وہ نہ تو تلخیِ مضمون سے گھبراتے ہیں نہ تلخیِ کلام سے گریز کرتے ہیں، نہ زہر کو قند بنا کر پیش کرنے کے قائل ہیں، نہ قند کی حقیقت سے انکاری اور اس کے باوجود کیفؔی کی شاعری زہر اور قند کا ملغوبہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک متوازن ٹھہرے ہوئے درد مند، فکر انگیز احساس اور نظریۂ حیات و فن کا بلیغ اظہار ہے''۔ (پیش لفظ، آوارہ سجدے، ص ۷)

کیفؔی اعظمی کی تمام شعری تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کیفؔی اعظمی کو ترقی پسند شاعروں کی فہرست میں صفِ اول کا شاعر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اشتراکی وانقلابی نظمیں

۱۸۵۷ء کے غدر سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوستانیوں کی ذہنیت میں سرعت سے انقلاب ہوتا رہا۔ اس انقلاب نے نہ صرف یہ کہ سیاسی، سماجی اور معاشی نظامِ فکر کو متاثر کیا۔ اس انقلاب کا سب سے بڑا تصور تھا ملک کی آزادی، انگریزی حکومت کے جبر واستبداد سے نجات اور ان کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے والی قوم کی حفاظت کرنا۔ مزدوروں و کسانوں کو سرمایہ داروں، زمینداروں اور مل مالکوں کے ظلم وستم سے نجات دلانا اور قوم میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات پیدا کرنا اور انہیں بیدار کرنا۔ انھیں انقلابی تصورات نے ملک میں سیاسی، سماجی اور معاشی، غرض یہ کہ زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ اس لیے انقلاب کے بعد تخلیق کیا جانے والا ادب خود اپنے آپ کو اس تغیر کی زد سے محفوظ نہ رکھ سکا اور شاعری میں اس تغیر کا اولین نقش ''نظم اور کلامِ موزوں'' سے متعلق محمد حسین آزاد کا وہ لکچر قرار دیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ۱۸٦۷ء میں لاہور کی انجمنِ پنجاب کے ایک جلسہ میں دیا تھا۔ اردو شاعری کی

اصلاح کا خیال پہلے پہل آزاد ہی کے ذہن میں پیدا ہوا اور انہوں نے مروجہ روایتی اور تقلیدی شاعری کی کم مائیگی کو محسوس کیا۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے کے زیراہتمام نئی روایت کا آغاز ہوا۔ یہیں سے مولانا الطاف حسین حالؔی کو ادب کے ایک نئے تصور کی راہ ملی اور اردو شاعروں وادیبوں نے پہلی بار زندگی اور ادب کے باہمی رشتے کو سمجھنے اور اس کی نوعیت پر سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

حالؔی نے بھی زندگی کی مادی حقیقت اور اس حقیقت کے بدلتے ہوئے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی اہمیت محسوس کر کے شاعری کا رُخ خواب و خیال کی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف موڑنے کی کامیاب سعی کی۔ حالؔی کے ساتھ ساتھ اس ضمن میں مولانا شبلی کی خدمات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حالؔی نے اردو نظم کو نئی راہوں پر ڈالا۔ نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے چراغ روشن کیے اور اس کی رگوں میں خون کی گرمی پیدا کی۔ نئی جولانگاہوں سے روشناس کیا۔ نئے افق پر پرواز سکھائی۔ حالی کی مسدس نے شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اور ان کے ہم عصر اردو اور ہندی کے شاعروں نے اس قسم کی شاعری کو خیالات کی تبلیغ کے لیے بہت موزوں سمجھا۔ غرض یہ کہ حالؔی کی ''مسدس'' ادبی انقلابی اور قومی بیداری کی خبر دیتی ہے۔

آزاؔد، حالؔی اور شبلؔی وغیرہ نے جو بیج اپنی شاعری میں بوئے تھے وہ ان کے بعد آنے والی نسل کے شاعروں میں برگ وبار لائے۔ وہ تمام سیاسی، سماجی، مادی اور فکری تغیرات جس سے اس وقت ہندوستان گزر رہا تھا اپنے عہد کے قلم

کاروں کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اسمٰعیل میرٹھی، اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ، ظفر علی خاں اور محمد علی جوہرؔ وغیرہ کی شاعری اپنے عہد کے تقاضوں سے منھ نہ موڑ سکی۔ اقبال کی ابتدائی شاعری حب الوطنی کے عقیدے سے پُر ہے۔ چکبستؔ کی تقریباً تمام شاعری وطن کی محبت، اس کی عظمت، قومی اتحاد اور آزادی کے جذبات سے سرشار ہے۔ ان کے علاوہ اردو شاعری کو نئے افقوں سے روشناس کرانے والوں میں حسرتؔ موہانی، عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور فراقؔ گورکھپوری وغیرہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ۱۹۱۷ء میں انقلاب فرانس نے سیاست و معاشرت پر اثر انداز ہو کر ادبیات کو بھی متاثر کیا۔ یہ انقلاب صرف ادبیات فرانس پر ہی نہیں بلکہ یورپ کے ادب پر اور پھر اس کے توسط سے عالمی ادب پر اثر انداز ہوا۔ غرض یہ کہ انقلاب روس کا تمام اقوام مشرق پر گہرا اثر پڑا۔ انقلاب سے متعلق سجاد ظہیر فرماتے ہیں:

> ’’ظلم جب سر سے اونچا اور نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے تو لوگ بغاوت کر بیٹھتے ہیں اور پھر سماج نئی کروٹ لیتا ہے لیکن بغاوت اور انقلاب میں فرق ہی یہ ہے کہ بغاوت کے سامنے مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا اور انقلاب کے آگے سماج کی تشکیلِ نو کا ایک پورا منصوبہ ہوتا ہے‘‘۔ (روشنائی، سجاد ظہیر، ص ۱۲)

جیسا کہ سجادؔ ظہیر نے فرمایا کہ انقلاب کے آگے سماج کی تشکیلِ نو کا ایک

پورا منصوبہ ہوتا ہے تو اس منصوبے کی تکمیل کی خاطر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے اردو شعرا نے اپنی نظموں میں انقلابی رجحانات پر زیادہ سے زیادہ توجہ مرکوز کی۔ ایسے شاعروں میں سب سے پہلے جوشؔ ملیح آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد علی سردار جعفری، فیض احمد فیضؔ، مجازؔ، ساحرؔ لدھیانوی، جاں نثار اخترؔ اور کیفیؔ اعظمی وغیرہ سرفہرست آتے ہیں۔

جوشؔ سیاسی اعتبار سے عام طور پر ان ترقی پسند جماعتوں کی پالیسی سے متفق تھے جو ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ بغاوت کرنے والوں کے ساتھ خود بھی نعرۂ بغاوت بلند کیا۔ الفاظ کی گھن گرج اور لہجے میں آتش فشاں کا سا ابال اور گرمی، ان چیزوں نے ایک زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانے میں ہندوستان ایک شدید تناؤ کے عالم میں مبتلا تھا اور ہر فرد غلامی کا جوا اتارنے کے لیے بیقرار تھا۔ اس لیے غلامی سے بغاوت یا انگریزوں سے نفرت کا نعرہ مقبول ہوا۔ جوش اس زمانے میں شہرت کے آسمان پر پہنچے۔ کیوں کہ باغیوں کے اس ہجوم میں ان کی آواز سب سے زیادہ اونچی اور سب سے زیادہ کڑک دار تھی، لیکن جس طرح سوڈے کا اُبال دم کے دم میں ختم ہو جاتا ہے اس طرح جوشؔ کی وقتی نظموں کا وقتی اثر کم ہونے لگا۔ نقادوں نے اس پر تنقید بھی کی۔ مجنوںؔ گورکھپوری لکھتے ہیں:

> "جوشؔ کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر ایک کف در دہاں چیخ سے زیادہ وقیع نہیں، جوشؔ کی شاعری اندر سے بے انتہا، بے مغز اور کھوکھلی ہے"۔ (فکر و فن،

خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۴۲، تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

جوشؔ انقلاب کی تحریک میں جذباتی طور پر شریک ہوتے ہیں اور بعد میں جل کر اپنے آپ کو اشترا کی کہنے لگتے ہیں لیکن اشترا کیت سے ان کا تعلق محض رومانی ہے۔ اس لیے آگے چل کر ان کی شاعری خود اشترا کی نظریۂ انقلاب کی تکذیب کرنے لگتی ہے اور بقول فیض احمد فیضؔ غیر انقلابی اور غیر اشترا کی ہو جاتی ہے۔

جوشؔ کے یہاں انقلاب کا تصور بڑا ہولناک ہے۔ ان کو محض تخریب سے مطلب ہے۔ اس لیے کہ بغاوت ان کی فطرت ہے اور بغاوت کو تخریب سے تسکین ہوتی ہے۔ جوشؔ بغاوت کا خیال آتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اسی لیے ان کے یہاں تصورِ انقلاب میں تخریبی عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ خون، موت، آندھی، قتل و غارت، لوٹ اس کے مقابلے میں انقلاب کے مثبت پہلوؤں کا ذکر ہے اور انقلاب کے بعد کی خوشگوار زندگی کا تصور شاذ و نادر ہے۔

جوشؔ کی نظمیں حالیؔ اور اقبالؔ تک کی نظم نگاری پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خطیبانہ انداز بیان میں بھی جہاں کہیں وہ طولِ کلام اور تکرار سے بچ گئے ہیں وہاں یکجا ہونے کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی خطیبانہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے انقلابی شاعری میں ملتے ہیں۔ یہ وہی لہجہ ہے جو فکری سیاق و سباق کی تبدیلی کے ساتھ اقبالؔ کے یہاں سے ہوتا ہوا جوشؔ تک پہنچا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جوشؔ نے اس لہجے میں نرالا جوش اور آزادیٔ وطن کے لیے جہاد کا جنون بھر دیا۔ لہٰذا ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۰ء تک پوری ادبی نسل جوشؔ کی اولیت کے

سائے میں پروان چڑھی۔ اس میں سردار جعفری، مجاز، مخدوم، جاں نثار اختر وغیرہ بھی شامل ہیں۔

علی سردار جعفری کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے عوام کے لیے شاعری کی اور عوامی اصلاح وفلاح اور مسرت وخوش حالی کو اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا۔ شاعری کے ذریعے نظامِ حیات کو بدلنا چاہا۔ ان کا بڑا مقصد عوام میں تاریخی شعور پیدا کرنا اور ان کے ذہن کو انقلاب کے لیے تیار کرنا ہے۔ انہوں نے نظم کو خالص داخلی اور مبہم جنسی موضوعات کے جال سے باہر نکال کر عوامی مسائل کے لیے برتا ہے۔ عوام کی اقتصادی وسیاسی زندگی کی تصویر کشی، کسان اور جاگیردارانہ، غلام اور آقا، مزدور وسرمایہ دار، سامراج اور محکوم ملکوں کا تضاد آمادی کا پیغام سائنٹفک سیاسی نظریے کی ترسیل کرنا اور اکثر ان کی نظموں کا رشتہ براہ راست ملکی اور عالمی موضوعات سے منسلک ہے۔ جعفری کی انقلابی شاعری سے متعلق سید احتشام حسین فرماتے ہیں:

> ''وہ اس انسان دوست اور انقلابی کارواں میں شامل ہیں جن میں گورکی، مایا کاوسکی، پیلونرودا، ناظم حکمت اور لوئی آراگاں کے نام لیے جاتے ہیں'' (تنقید اور عملی تنقید، سید احتشام حسین، علی سردار جعفری، رومان سے انقلاب تک، ص ۲۶۳)

جعفری کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اس زمین پر نہ کوئی کسی کا آقا ہے نہ کوئی کسی کا غلام، ہر ایک کو بغیر کسی نسلی امتیاز کے آزادی کے ساتھ جینے کا حق ہے

اس خیال کے تحت جعفریؔ نہ صرف یہ کہ اپنے ملک کی خاطر بلکہ تمام ایشیائی ممالک کے لیے یکساں طور پر اشتراکی نظریہ رکھتے ہیں۔ اس خیال کے تحت جعفری نے کہا:

> ''میری شاعری خواص کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے ہے۔ اور میری خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے سمجھیں، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور، کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان''۔ (علی سردار جعفری، شخصیت اور شاعری، محمد ایوب واقف، ص ۱۲۴)

قومیت، عالمگیریت اور آفاقیت کے تصورات ترقی پسند شاعری میں فیضؔ اور ساحرؔ، مخدومؔ اور جذبی سب کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو ملتے ہیں جن کی بنیاد آدمیت کے احترام اور اس کرۂ ارض کو جنگوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے کی خواہش ہے۔ یہ تصور کہ ساری دنیا کے عوام ایک ہیں خواہ علاقائی اور پیشہ ور سیاست دانوں کے اختلافات کچھ ہی ہوں۔ ہر دور کی اچھی تحریک کا حاصلِ ایمان رہا ہے۔ جعفریؔ کے یہاں بالخصوص تین شرابی اور مشرق و مغرب جیسی نظموں میں یہ تصور کہیں زیادہ پر اثر اور تابناک ہے۔ غرض یہ کہ فیض کے بعد اردو کی انقلابی شاعری میں جعفریؔ کی شاعری اہم مثال ہے۔

فیضؔ ذاتی طور پر عشق و محبت کے رومان میں جذب رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن جس ماحول سے ان کا تعلق ہے وہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور طرح طرح سے مزاحمت و مخالفت کرتا ہے۔ لہٰذا وہ ایسے ماحول سے بغاوت ہی نہیں کرتے

بلکہ انقلاب کا جھنڈا اٹھاتے ہیں۔ اس طرح ان کا ذاتی غم غمِ کائنات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس غمِ کائنات میں کسی خاص تہذیب کی قدروں کے تحفظ کی فکر نہیں ہے نہ اس کے ساتھ کوئی جذباتی وابستگی۔ اس لیے کہ فیضؔ ترقی پسند ہیں۔ تبدیلیوں کو وہ جزوِ ایمان تصور کرتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر فرسودہ سماج کی جگہ ایک نیا سماج تشکیل دینا چاہتے ہیں۔ ایک نئی تعمیر کے لیے پرانی عمارت کی تخریب ضروری سمجھتے ہیں۔ جس نصب العین کے مطابق وہ تخریب و تعمیر کے گویا تاریخی عمل سے گزرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق ان کے مخصوص معاشرے سے نہیں ہے۔ وہ ان کے خیال میں ایک عالمی نظریہ ہے۔ اور آفاقی مطمحِ نظر رکھتا ہے اس کا نام بین الاقوامی اشتراکیت ہے جو جدلیاتی مادیت کی بنیاد پر دنیا میں سماجی انصاف قائم کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب فرماتے ہیں:

> ''زندگی کی مسرتوں کا احساس اور اس کو برتنے کی خواہش، حالات کو سمجھنے کا شعور، ان کو صحیح ڈگر پر لانے کی تمنا اجتماعی نقطۂ نظر کے سہارے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اجتماعی نقطۂ نظر نے فیضؔ کی نظموں میں ہی یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ انہیں حالات کو بدلنے کی فکر نے حالات کو وجود میں لانے کی تمنا، نئے ماحول کو پیدا کرنے کا یقین محکم ہے''۔ (جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۴۷۲)

فیضؔ کی نظم ''شیشوں کا مسیحا'' میں ان کی انقلابی فکر بہت نکھری ہوئی

ہے۔اس نظم میں فیضؔ کی فکر سے انقلابی یکسوئی حاصل ہوتی ہے، اس کی محبت انہیں اپنے فن کی جمالیاتی ثروت کو مجروح کر کے ادا کرنی پڑتی ہے۔ ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے''، ''ایرانی طلبہ کے نام''، ''شیشوں کا مسیحا''، ''کوئی نہیں'' یہ تینوں نظمیں ایک ہی قسم کے سیاسی تجربہ واحساس پر مبنی ہیں اور بغاوت و انقلاب کی دعوت دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ فیضؔ کا شعور یقیناً انقلاب اور عشق کے تصورات و تخیلات کے درمیان منقسم ہے۔ فیضؔ کے یہاں حالات کو سازگار بنانے اور آزادی حاصل کرنے کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرنے کی تاکید ہے۔ فیضؔ کے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں:

> ''ان کے خیال میں شاعر کا کام مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے''۔ (جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۴۷۷)

فیضؔ نے زمانے کے سیاسی اور سماجی کرب واضطراب کو آخری دم تک برداشت کیا۔ انقلاب کے نعرے کی نغمگی اور ساحرانہ کیفیت عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی انقلابی شاعری کو اس کی عظمت سے روشناس کرایا۔ فیضؔ اور جعفریؔ کی طرح مجازؔ بھی زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ملک کی آزادی میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

مجازؔ نے اپنی شاعری کا آغاز ایسے زمانے میں کیا جب ملک میں نئی قدریں جنم لے رہی تھیں۔ یہ زمانہ سیاسی، ادبی و تہذیبی ہر لحاظ سے ایک

زبردست انقلاب اور بیداری کا زمانہ تھا۔ نئے نئے خیالات زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو رہے تھے ایک خاموش انقلاب ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ زمانے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر مجاز بھی نہ رہ سکے۔ بقول آل احمد سرور:

> ''مجاز نمائش صبح بہار کا لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔'' (بحوالہ ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد، عہد جدید کے ممتاز شعرا، ص ۱۶۰)

مجاز نے ماحول کے نئے تقاضوں کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ زندگی کے اجتماعی پہلوؤں اور اس کے مختلف معاملات و مسائل کو بنیاد بنا کر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں اخوت اور آزادی محبت اور مساوات کی قدروں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''مجاز کی شاعری میں ایک نئی آواز سنائی دیتی ہے اس کو محض جذبات کا ابال نہیں کہا جا سکتا۔ وہ محض تخیل کی پیداوار نہیں ہے اس میں عقل و شعور کی فراوانی ہے اور اس منزل تک پہنچنے میں اس کو کئی منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ شروع شروع میں ایک جذباتی لے ملتی ہے اور ایک قسم کی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے ایک طرح کی شدت اور انتہا پسندی نظر آتی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں توازن پیدا ہوتا جاتا ہے اور شعور کی فراوانی اس میں ایک رکھ رکھاؤ پیدا کر دیتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ

کر وہ صرف ایسی شاعری نہیں رہ جاتی جو محض انقلابی ہو،
بلکہ اس میں حریت اور آزادی، اخوت اور محبت، انسان
دوستی اور مساوات کے خیالات رونما ہونے لگے ہیں"۔
(جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی،ص ۳۴۷۔
۳۴۸)

مجاز نے عظمتِ انسانیت کے زمزمے گائے ہیں۔ اپنا خون بہا کر زمین سے مہکتے گلاب پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ مجاز کو بھی یقین تھا کہ حریت کا آفتاب جلد ہی جگمگانے والا ہے۔

لہٰذا مجاز نے ملک کی آزادی وسرمایہ داری کا خاتمہ اور سوشلزم کے قیام کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ غالباً ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا جب ہندوستانی نوجوانوں میں ایک عام بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جس سے حکومت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس قسم کے باغیانہ خیالات ملک کے نوجوانوں کو بے حد عزیز تھے۔ مجاز کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے باغیانہ خیالات کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا اور ایک نہایت سرمستی اور شیرینی کے ساتھ سماجی شعور کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ سماجی انصاف، عورت اور مرد کے مساوات، مزدور اور دبے کچلے عوام کی سربلندی کی آرزو مجاز کی شاعری کے موضوع بن گئے۔ مجاز، فیض، جعفری، وامق، مخدوم وغیرہ کی طرح ساحر لدھیانوی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے انقلابی واشتراکی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔

اپنے زمانے کے تمام ہم عصر شعرا کی طرح ساحؔر لدھیانوی کے یہاں بھی ایک انقلابی نوجوان کا ذہن ہے۔اس لیے وہ آس پاس اور گردوپیش کی زندگی کو اس انقلابی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور عام موضوعات میں بھی نئے پہلو پیدا کرنا ان کی شاعری کی خصوصیات میں داخل ہیں۔عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''وہ بھی حالات کو بدلنے کی فکر میں ہے۔وہ بھی انقلاب کا خواب دیکھ رہا ہے اور اس میں اسے دنیا کی نجات نظر آتی ہے۔ان کا موضوع انسانیت ہے اور وہ انسانیت اور اس کی بنیادی قدروں کی ترجمانی کرنے میں مصروف ہے''۔(جدید اردو شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۷۶)

ساحؔر نے انسانیت کی بنیادی قدروں کو اپنا موضوع بنا کر حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ان گیتوں میں بھی سماجی مسائل کو سمویا ہے اور شاعری میں زندگی کے اہم مسائل پیش کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں۔ظفر ادیبؔ صاحب لکھتے ہیں:

> ''مجازؔ اور ساحؔر گو دیر تک انقلابی شاعر نہ رہ سکے پھر بھی ان کے یہاں انقلابی فلسفے کی یہ گونج ایک بازیافت کی حیثیت رکھتی ہے۔فردوس گم گشتہ کی بازیافت، طلوع سحر اور طلوعِ اشتراکیت دونوں اس کی مظہر ہیں۔''
> (گفت وشنید، ظفر ادیب، ساحر لدھیانوی، ص ۲۴۶)

ساحرؔ کمیونزم سے بہت زیادہ متاثر تھے انہوں نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے:

"میں کبھی کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں رہا۔ غلام ہندوستان میں آزادی کے مثبت پہلو ڈھونڈنا اور ان کا پرچار کرنا میرا نصب العین ضرور رہا ہے۔ اب ذہنی طور پر اقتصادی آزادی کا حامی ہوں جن کی واضح شکل میرے نزدیک کمیونزم ہے"۔ بحوالہ گفت وشنید، ظفر ادیب، ساحر لدھیانوی، ص۲۴۲، ۲۴۳)

قومی آزادی کی لڑائی ہو یا بحری بیڑے کی بغاوت، فرقہ وارانہ فسادات کی قیامت خیزی ہو یا جنگ کی تباہ کاری، ہندو پاک لڑائی کی لعنتیں ہوں یا بین الاقوامی سطح پر عوام دوست رہنماؤں کی شہادت اوروں کے ساتھ بے انصافی ہو یا مزدور کسانوں کا استحصال، ساحرؔ کی آواز نغمہ بار رہی ہے اور ان کا دل عوام کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکتا ہے۔ یہی ہم آہنگی ان کی شاعری میں توانائی سرمستی اور نغمگی بن کر ابھرتی ہے۔

برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں تمام شعرا کی طرح اخترؔ نے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اور اپنے قلم کی اس جدوجہد میں شامل رہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کو سماجی آزادی کے تصور سے آشنا کیا بلکہ عملی اعتبار سے ایک ایسا سماج قائم کرنے کی کوشش کی جس کا خواب صدیوں سے پس ماندہ عوام دیکھ رہے تھے۔ ہر شخص کو آزادی، امن اور

سکون میسر ہو۔اختر نہایت آسودہ خاطری کے ساتھ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں جس سے تنگ نظری اور قدامت پرستی کا خاتمہ ہو سکے۔ تعصب کے مہلک اثرات معاشرہ کی جڑوں کو کھوکھلا نہ کردیں۔غرض یہ کہ اختر کی شاعری کی عام فضا عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں جس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی آمیزش ملتی ہے۔

اختر کی شاعری فن برائے فن نہیں بلکہ فن برائے زندگی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کے لیے ایک پیغام ہے۔زندگی سے جدوجہد کرنے کی ترغیب ہے۔ان کی شعلہ خوانی سے انصاف اور آزادی کی جدوجہد میں لاکھوں دکھی عوام کے دلوں کو گرمی اور ذہنوں کو روشنی ملتی ہے۔ جاں نثار اختر کے مجموعۂ کلام ''خاکِ دل'' میں شامل اخترؔ کے نام ایک خط میں علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''تم نے ظلم کے خلاف احتجاج کیا اور انسان کی عظمت کی سربلندی کے لیے قربانیاں دیں۔اس کی آنچ تمہارے شعر میں ہے۔'' (خاکِ دل، جاں نثار اختر ص ۱۱)

اختر کی سیاسی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سیاسی نظریہ اشتراک بقائے باہمی اور عالمی امن و یکجہتی کے عقیدوں پر مشتمل ہے۔ وہ یہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ ادب کو صرف حسن و عشق تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ ادب پوری زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی اور اقتصادی سبھی قسم کے مسائل آجاتے ہیں۔اختر کی شاعری کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسانیت

کا ایک بڑا طبقہ مٹھی بھر افراد کے سیاسی، سماجی اور معاشی استحصال سے بچا رہے اور زندگی کی راحتوں اور برکتوں سے عالم انسانیت یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔

ترقی پسند شاعروں کے یہاں رومانی اور انقلابی دونوں قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ رومانی شاعری کے تین محور ہیں۔ تخیّل، جذبہ اور وجدان، خود کلاسیکی شعرا نے زندگی کے عمومی حقائق کو ہی موضوعِ سخن بنایا تھا۔ رومانی شاعر زندگی کے نہاں خانوں میں اپنے موضوع کی تلاش کرتا ہے اور تجربے کے بے ہنگم مواد میں وہ ایک ایسی معنویت کا متلاشی ہے جو منفرد ہو اور کسی دوسرے کے سعیِ فکر کی مرہونِ منت نہ ہو۔ غرض تمام رومانی شعرا وجدان کے پرستار ہیں اور ان کی شاعری کی بنیاد بھی وجدان کے لیے ہے۔

انقلاب اصولوں، معیاروں اور اقداروں کی اس تبدیلی کا نام ہے جو ایک تاریخی ضرورت اور جدلیاتی مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے آج کل کے سیاسی و سماجی حالات میں انقلاب عبارت ہے اس تبدیلی سے جو سرمایہ داری کا اور اس کے ساتھ جاگیرداری کے باقیات کا خاتمہ کردے۔ جو ذرائعِ پیداوار کو افراد کی ذاتی ملکیت سے نکال کر سماج کی مشترکہ ملکیت میں لے آئے۔ سیاسی و اقتصادی قوت استحصالی طبقوں سے چھین کر محنت کش عوام کے ہاتھوں میں دیدے۔ یہ تبدیلی سطحی اور معمولی تبدیلی نہیں ہوگی بلکہ سماج کی بناوٹ میں ایک گہری اور بنیادی تبدیلی ہوگی اسی تبدیلی کا نام انقلاب ہے۔ انقلابی ادب وہ ہے جو سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو تنقید کا نشانہ بنانے اور تبدیلی لانے کی ضرورت کا احساس دلائے۔ ملکی نظام میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرے۔ انقلابی

ادب تخریبی بھی ہوتا ہے اور تعمیری بھی کیونکہ یہ حال کی بنیادوں کو ڈھا کر نئی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ مختصر یہ کہ انقلابی ادب پرولتاری اور عوامی نقطۂ نظر سے زندگی کی تفسیر و تنقید کا نام ہے۔

ترقی پسند شاعروں کے یہاں بہت سی ایسی نظمیں ملتی ہیں جو رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ انقلابی بھی ہیں۔ جیسے فیض احمد فیض کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''، علی سردار جعفری کی نظم ''نئی دنیا کو سلام''، ساحر لدھیانوی کی نظم ''تاج محل'' وغیرہ۔ اس طرح اور بہت سے شاعروں کے یہاں بھی اس قسم کی نظمیں ملتی ہیں جسے رومانی اور انقلابی دونوں کہا جا سکتا ہے۔ کیفی اعظمی کی نظم ''عورت''، ''پیتل کے کنگن''، ''گلدستہ''، ''اخفائے محبت'' وغیرہ رومانی اور انقلابی دونوں قسم کی نظموں کی بہترین مثال ہے۔

کیفی اعظمی کے یہاں انقلاب کا تصور غلامی کی زندگی سے آزادی حاصل کرنا، مزدوروں، کسانوں کو ان کا حق دلانا، معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو روکنا، ان قدیم روایات سے بغاوت کرنا جو انسان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کریں، عوام کو اپنی قوت کا احساس دلانا اور ان کے اندر جوش و ولولہ، عزم، ہمت و استقلال کی تلقین کرنا، اس کی بہترین مثال عورت، روسی عورت کا نعرہ، جیل کے در پر، آخری مرحلہ اور مکان وغیرہ نظمیں ہیں۔

مارکسی فلسفہ تاریخِ انسانیت کا بہ حیثیت مجموعی تجزیہ کرتا ہے اور انسانی ترقی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں دیکھتا۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان قوانین کو دریافت کرے جس سے انسانیت کے باہمی رشتے متعین ہوتے ہیں۔ اس لیے

پرولتاری انسانیت پسندی کا منصوبہ یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی مجموعی حیثیت سے تعمیر نو کرے اور اس کو ہر قسم کے انتشار اور ہر طرح کی تخریب سے پاک کرے جن کی وجہ سے وہ طبقاتی سماج میں مجروح ہوگئی ہے۔

مارکس کا انقلابی تصور اشتراکیت ہے اس لیے مارکس کے انقلابی تصورات کی پیروی کرنے والے سبھی اشتراکی ادیب ہر انسانی تجربے کو اپنے نظریاتی مقاصد کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور اپنے تحفظات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس تجربے کو صحیح یا غلط اور حقیقی یا غیر حقیقی کہتے ہیں۔ ہر انسانی عمل کو اپنے آدرش کے تابع قرار دیتے ہیں۔ ہر مقصد کو اپنے ذہنی مسلک سے مشروط کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکی ادیب مادی خوش حالی اور ذہنی سکون کو لازم وملزوم تصور کرتے ہیں اور سرمایہ دار ملکوں کے غیر اشتراکی ادیبوں کو بورژوا سیاست کا غلام بھی کہتے ہیں۔ اشتراکی شاعری سے متعلق شمیم حنفی فرماتے ہیں:

> ''مارکسزم اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیاد ہے اور اشتراکی حقیقت نگاری بین الاقوامی سطح پر ادب میں ترقی پسند تحریک کا سرچشمۂ فیض ہے''۔ (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، شمیم حنفی، ص ۳۰۱)

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ انقلاب جو مارکسی نظریات کا حامل ہے وہ بھی انقلاب ہے جس کی پیروی بہت سے ترقی پسند شعرانے کی ہے۔ ان میں کیفی اعظمی کا نام سرفہرست ہے۔ جس کا اندازہ ان کی اشتراکی نظموں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

کیفی اعظمی کے پہلے مجموعۂ کلام ''جھنکار'' میں مختلف انقلابی، اشتراکی اور آزادی سے متعلق نظمیں شامل ہیں جیسے، جیل کے در پر، کشمکش، بیکاری، عورت، آخری امتحان، اسٹالن کا فرمان، اسٹالن، بیکار مزدور، مغالطہ، لیڈر کی آمد، مشورے، ماحول، صبحِ وطن، بیوہ کی خودکشی، آواز کی شکست، سر کی موت، وصیت جوہر، پیتل کے کنگن، آندھی، تاج، حقیقتیں، آخری جنگ، موجودہ جنگ، اور ترقی پسند عناصر، روسی عورت کا نعرہ، اعتراف، استقلال، ساقی، گورنر کی اسپیشل گمراہ ولیعہد، دستور، بخشش، دھواں، تاج محل، انتباہ اتحادیوں کے نام جگاوا، روسی عوام اور جنگ، برما کا چاول، نئی صبح۔

نظم ''جیل کے در پر'' کا موضوع ایک نوجوان انقلابی ہے اس کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے جو خود قید و بند کی مشقتیں برداشت کر کے ملک کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے بعد آنے والی نسل کو غلامی کی یہ صعوبتیں برداشت نہ کرنی پڑیں۔ اس کے علاوہ اس عورت کے جذبات کی بہترین ترجمانی ملتی ہے۔ جو اپنے انقلابی شوہر کے جوش، ولولہ اور وطن سے بے لاگ محبت کو دیکھ کر اس کی کامیابی کی دعا کرتی ہے اور آخر کار انقلاب آ ہی جاتا ہے۔ کیفی کے لفظوں میں:

کہہ اٹھا کیفی ہر اک ذرہ بصد قہر و عتاب

انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب

ایک نوجوان انقلابی کے جذبات نگاری کے لحاظ سے نظم موثر ہے۔

نظم ''کشمکش'' کا موضوع طبقاتی جنگ ہے۔ اس جنگ کے ماحول میں

ایک شاعر کی حیثیت سے کیفی نے جو کچھ محسوس کیا اس کا اظہار اس نظم کے ذریعے موثر انداز میں کیا ہے۔ نظم کا ایک ایک لفظ درد و کرب میں ڈوبا ہوا دل کو چھونے والا ہے۔ نظم کے آخری بند سے شاعر کی بے چینی و کرب اور بے بسی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

میرے اللہ!

میں کدھر جاؤں

تو نہ دے گا اگر جواب مجھے

مار ڈالے گا اضطراب مجھے

خود نہیں سوچنے کی تاب مجھے

کھینچ لیتا ہے انقلاب مجھے

اس نظم میں کیفی کی تمام الجھنوں اور پریشانیوں کی وجہ ملک کی آزادی، آپسی جنگ اور مظلوم عوام کی مظلومیت ہے۔ جسے شعری قالب عطا کرنے میں کیفی کامیاب ہیں۔ نظم کا ایک ایک لفظ دل کو چھوتا ہے۔ شاعر کے ذاتی احساسات و رنج والم کی ترجمانی کے لحاظ سے بھی نظم موثر ہے۔

نظم ''بیکاری'' ظالم سرمایہ داروں اور مل مالکوں کے لیے ایک ہدایت ہے کہ کمزور سے کمزور انسان بھی پوری زندگی ظلم وستم برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک دن بغاوت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مزدوروں کی زبان میں کیفی فرماتے ہیں:

گرج اے بغاوت کہ تیار ہوں میں

بڑا دکھ ہے مجھ کو کہ بے کار ہوں میں

اس نظم کے ذریعے کیفی نے سرمایہ داروں، زمینداروں، حکمرانوں، مل مالکوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ مزدوروں کسانوں پر ظلم وستم ڈھانا چھوڑ دیں ورنہ ان کی بغاوت ان کے حق میں زیادہ مضر ثابت ہوسکتی ہے۔

نظم "عورت" کا موضوع صدیوں سے قدیم روایات کے شکنجے میں دبی اور کچلی ہوئی عورت ہے۔ کیفی نے اس نظم کے ذریعے عورت کو اس کی اپنی طاقت کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کیفی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے عورت کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا ہے اور اس کی اہمیت کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

عورت کے متعلق کیفی کے اس خیال سے ملتے جلتے خیالات کچھ حد تک مجآز کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مجآز اپنی "نظم" "نوجوان خاتون" میں کہتے ہیں:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

کیفی اور مجآز کے اندازِ بیاں اور لہجے میں فرق ہے۔ کیفی نے ایک دم

کہہ دیا کہ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔لیکن مجازؔ کے کہنے کا انداز یہ ہے کہ اگر تو
چاہے تو اچھا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجازؔ نے عورت کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے،
غرض یہ کہ عورت کو اس کا اصلی حق دلانے کی جو بے چینی و کرب اور اضطراب کیفیؔ
کے یہاں ہے وہ مجازؔ کے یہاں نہیں ہے۔اس کے علاوہ فیض احمد فیضؔ، وامقؔ
جونپوری،ن۔م راشد،ان تینوں شعرا نے عورت سے متعلق نظمیں لکھی ہیں۔لیکن
تینوں شعرا کے نظریات کیفیؔ اعظمی کے نظریات عورت سے بالکل اور قطعی مختلف
ہیں جس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔فیض احمد فیضؔ کا خیال
ہے کہ:

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

وامقؔ جونپوری اپنی نظم ''پاپی'' میں فرماتے ہیں:

زندگی میں عشق سے بڑھ کر مراحل اور ہیں
اس زمانے میں تمنا اور ہے دل اور ہیں
میری دنیائے جنوں کے اب مشاغل اور ہیں

راشدؔ کا خیال (نظم سپاہی) یہ ہے کہ:

جنگ آزادی میں کام آنے بھی دے
تو مرے ساتھ مری جان کہاں جائے گی

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیفیؔ اعظمی نے نظم ''عورت'' کی تخلیق کر کے

عورت کے کرداراور شخصیت کو ترقی دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

نظم ''آخری امتحان'' کا موضوع روس کی جنگِ آزادی ہے۔ کیفی نے اس نظم کے ذریعے روسی سپاہیوں کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے ان کو کامیابی کا یقین دلایا ہے:

ہے بدلنے پہ وقت آمادہ
خون تیرا رائگاں نہیں ہوگا
آخری ہے یہ موت کا حملہ
اب کوئی امتحاں نہیں ہوگا

نظم مبالغہ آرائی سے پاک اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اندازِ بیان پُر اثر اور پُر خلوص ہے۔ کیفی نے اس نظم کے ذریعے روسی سپاہیوں کے اندر جو طاقت اور قوت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بے مثال ہے۔ اس لحاظ سے نظم کارآمد ہے۔

نظم ''اسٹالن کا فرمان'' نظم ''آخری امتحان'' کی ایک دوسری کڑی معلوم ہوتی ہے۔ ''آخری امتحان'' میں کیفی خود روسی سپاہیوں سے مخاطب ہیں اور انہیں ثابت قدم رہنے کا پیغام دیتے ہیں۔ نظم ''اسٹالن کا فرمان'' میں روسی سپاہیوں کا رہنما اسٹالن انہیں جو حکم دیتا ہے اسے کیفی نے دلکش انداز میں شعری قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس کے بعد نظم ''اسٹالن'' دونوں نظموں کی بہترین کڑی ہے اس نظم کا موضوع روسی سپاہیوں کے رہنما اسٹالن کی فتح و کامرانی ہے۔ اس نظم کا خاص مقصد اسٹالن کی شخصیت پر روشنی ڈالنا ہے۔ جو رہنماؤں اور

لیڈروں کے لیے ایک سبق آموز شخصیت ہے۔ کیفی نے پر جوش لہجے میں کہا:

آفریں کامریڈ اسٹالن

آدمیت کا پاسباں ہے تو

نظم کی دسری خصوصیت اسٹالین کی شخصیت کی قصیدہ خوانی ہے جسے نظم کرنے میں کیفی کامیاب ہیں۔ لیکن اکثر مصرعوں میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر دو مصرعے ملاحظہ ہوں:

زلزلے مضمحل قدم میں ترے

دم بخود آندھیاں ترے آگے

اس کے برعکس کچھ ایسے مصرعے ہیں جو خوبصورت اور حقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں:

آج مرکز ہے تو امیدوں کا

خم ہے فرقِ جہاں ترے آگے

اس میں کسی قسم کا کوئی مبالغہ نہیں۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر اچھے رہنما اور لیڈر سے عوام کو اپنی بہتری کی امید ہوتی ہے۔ اس لیے عوام ان کے اشاروں پر بے جھجک آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اچھے رہنماؤں کی بہترین مثال اسٹالین ہے اس لیے اس کے آگے تمام جہاں جھکتا ہے۔

نظم ''بیکار مزدور'' کا موضوع مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان ہونے والی بغاوت اور مزدوروں کی ہڑتال ہے۔ ان کے احساسات، جذبات اور خیالات کا اظہار کرنا نظم کا خاص مقصد ہے۔

نظم ''مغالطہ'' کا موضوع جدید ذہن رکھنے والی نوجوان نسل اور قدامت پسند، روایت پرست بزرگ ہیں جونوجوان نسل کی ترقی میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسے بزرگوں پر کیفی نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی ہے۔ یعنی آج موجودہ وقت کا نوجوان کیا چاہتا ہے۔ اس کے بزرگ اپنے زیرِسایہ ان کی تربیت کس طرح کرنا چاہتے ہیں اس کا اندازہ کیفی کی اس نظم کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے۔ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے بچپن اور جوانی کے وقت کو بھول کر نوجوان نسل پر سخت پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ تنقیدیں کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کو اپنے پچھلے کارناموں کی یاد دلاتے ہوئے کیفی اپنے شعری الفاظ میں یوں گویا ہوتے ہیں:

آپ تو یاد کیجئے آپ کہاں سے آئے ہیں
اپنے سلف کے نقش پا ٹھوکروں سے مٹائے ہیں
طاق حیات سے تمام ماضی کے بت گرائے ہیں
سارے قدیم مورچے توڑے ہیں ڈھائے ہیں

کیفی اعظمی کی یہ نظم قدامت پسند، روایت پرست بزرگوں کے لیے ایک نصیحت ہے کہ وہ نوجوان نسل کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا کریں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ آج کی رکاوٹ ان کی پوری زندگی کی رکاوٹ بن جائے۔

نظم ''لیڈر کی آمد'' کا موضوع لیڈر کی عیش پرستی اور غریبوں، مظلوموں کی طرف سے اس کے بے توجہی پر طنز ہے:

اس قدر بارش نعمت یہ ضیا کا سیلاب
کیسے محسوس ہو تاریک ہیں بھوکوں کے کھنڈر

لیڈر کی اس بے توجہی کی بنا پر کیفؔی نے اسے غالبؔ کے معشوقہ کے مماثل قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیفؔی کی اس نظم کا اختتام غالبؔ کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کیفؔی اپنے غیر ذمہ دار رہنما اور لیڈر کو قطعی پسند نہیں کرتے جو اپنی عیش پرستیوں و سرشاریوں میں مشغول رہے، غریب عوام کو بھول جائے اپنے فرائض کو بھول جائے، یعنی کیفؔی اسٹالین جیسے لیڈر کو پسند کرتے ہیں جس کا ذکر انھوں نے اس سے قبل روس کی جنگِ آزادی سے متعلق نظموں کے عنوان میں کیا ہے۔

نظم ''مشورے'' کا موضوع رات کے اندھیرے میں سمندر کے کنارے سفر کرتا ہوا وہ بزرگ مسافر ہے جو انقلاب کا خواہاں نظر آتا ہے۔ کیفؔی کا یہ مشورہ اس کے حق میں بہتر ہے کہ اس کا کمزور جسم یہ سفر طے نہیں کر سکتا لہٰذا نوجوان نسل پر یہ کام چھوڑ دے اور پریشان نہ ہو۔

یہ نظم مشورے کے لحاظ سے تو اپنی اہمیت کی حامل ہے ہی لیکن اس کے علاوہ رات کی منظر نگاری کی بھی بہترین مثال ہے۔

نظم ''ماحول'' جدوجہد آزادی کے دور کی تخلیق ہے ہندستاں میں

جدو جہد آزادی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندوستانی عوام کو یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ اب آزادی حاصل ہو کر رہے گی اور آزادی کی فضا میں وہ سانس لیں گے۔ لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے کیفؔی کو احساس تھا کہ آزادی کی جنگ کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہوگا۔ اس کی خاطر ابھی بہت سی قربانیاں دینی ہوں گی۔ لہٰذا فوری طور پر عوام کی خوشی کو مایوسیوں میں تبدیل نہ کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ شاعر مسکراتا تو ہے لیکن اس کی اس مسکراہٹ میں غم کی پرچھائیاں صاف نظر آتی ہیں مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

امیدوں کی تجلی خوب برسی شیشۂ دل پر
مگر جو گرد تھی تہہ میں وہ اب تک پائی جاتی ہے

اس کے علاوہ کیفؔی کی یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں غلامی سے آزادی اور انقلاب لانے کی خواہش جوش وولولہ، ایثار و قربانی کے جذبات عشق و محبت کے جذبات پر حاوی ہیں۔ چنانچہ بہت ہی درد بھرے لہجے میں کیفؔی کہتے ہیں:

مرے مطرب نہ دے لِلّٰہ مجھ کو دعوتِ نغمہ
کہیں ساز غلامی پر غزل بھی گائی جاتی ہے

نظم ''صبحِ وطن'' کا تعلق مندرجہ بالا نظم ''ماحول'' سے ہے۔ دونوں نظموں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کیفؔی کی شخصیت ایک ایسی شخصیت ہے جو اپنی ذاتی خوشی کو مظلوم عوام اور مجاہدین آزادی کے نوجوانوں کی خوشی پر ترجیح دیتا ہے۔ نظم ''ماحول'' میں شاعر اس بات سے غمگین ہے کہ انقلابی

نوجوانوں کو ابھی بہت سی قربانیاں دینی ہوں گی۔ نظم ''صبحِ وطن'' میں ان مجاہدینِ آزادی کا خیال کیفیؔ کو رنجیدہ کیے دیتا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو قربان کر کے ملک کو آزادی بخشی۔ لیکن بد قسمتی سے ملک کی اس آزاد فضا میں سکون کی ایک سانس لینا بھی انہیں میسر نہ آیا۔ لہٰذا غم انگیز لہجے میں کیفیؔ کہتے ہیں:

کس کو پہلو سے ہم اٹھا کے دکھائیں
آج صبح وطن کے نظارے
اور سب کچھ ہے تم نہیں لیکن
تم نہیں ہو تو کچھ نہیں پیارے

کیفیؔ ہی کی طرح فیضؔ بھی آزادی کی صبح سے پوری طرح مطمئن نہیں نظر نہیں آتے فیضؔ کو تقسیم ملک کا خطرہ لاحق ہے مثال کے طور پر فیض کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیضؔ کی ایک نظم ''صبحِ وطن'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صبح آزادی کی منظر نگاری بہترین انداز میں کی ہے۔

نظم ''بیوہ کی خودکشی'' کا موضوع ہندوستانی معاشرے کی قدیم روایت میں زندگی بسر کرنے والی ایک مجبور و بے کس، بے سہارا بیوہ عورت ہے جو زمانے کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر آخر کار خودکشی کر لیتی ہے۔ کیفیؔ اس کی خودکشی پر خوش ہوتے ہیں اور اسے بشارت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اور کر اک آہ سلگے ہند کی رسموں کا دام
اے جواناں مرگ بیوہ تجھ پہ کیفؔی کا سلام

کیفؔی اس خیال سے خوش ہیں کہ شاید اس طرح چند اور بیوہ عورتوں کی خودکشی سے خوف کھا کر زمانہ ان پر ظلم وستم ڈھانا چھوڑ دے۔ بیوہ عورت کی جذبات نگاری کے لحاظ سے نظم مؤثر ہے۔

نظم ''آواز کی شکست'' کا موضوع جدوجہد آزادی ہے۔ ابتدائی چند اشعار کو چھوڑ کر پوری نظم ڈرامائی انداز میں ہے اس کے دو خاص کردار ہیں۔ ایک انقلابی نوجوان دوسرا موہوم آواز جو قیاسی اور نسوانی کردار ہے۔ دونوں اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔

کیفؔی نے اس نظم کے پہلے چند اشعار میں اس تاریک و وحشت ناک پُرہول ماحول کا منظر حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ جس وقت نوجوان انقلابی سپاہی اپنی محبوبہ کو چھوڑ کر جدوجہد آزادی میں مشغول ہو جاتا ہے۔

نظم ''سرکی موت اور وصیت'' اس نظم کے ذریعہ کیفؔی اعظمی نے ان لوگوں پر کاری ضرب لگائی ہے جو صرف اپنے مفاد کی خاطر زندگی گزارتے ہیں۔ ملک اور افراد کی بھلائی کا جذبہ ان میں قطعی نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا ایسے خودغرض اور مفاد پرست انسانوں کو اس دنیا میں جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

نظم ''جوہر'' کا موضوع غلام ہندوستان اور انگریز ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان خود بخود اپنی غلطیوں اور لاپرواہیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی قوم کے ساتھ کچھ اس قسم کے واقعات درپیش ہوئے کہ وہ اپنی ہی غلطیوں اور لاپرواہیوں کی بناپر انگریزوں کی غلام بن گئی۔ اس نظم کے ذریعے کیفی نے اس بات کا احساس دلایا ہے کہ انسان دوبارہ اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہونے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوشش کریں تو مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل ہوسکتا ہے۔

نظم ''پیتل کے کنگن'' اس بات کا بہترین ثبوت ہے کہ جب ظلم وستم کی حد ہو جاتی ہے تو مظلوم خود بخود بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

نظم ''آندھی'' کا موضوع ہندوستان کی آزادی ہے۔ یہاں پر آندھی سے مراد آزادی کی آندھی ہے۔ جس کا احساس شاعر کو قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ اس پوری نظم کا مفہوم نظم کے آخری پانچ مصرعوں میں پنہاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

نشانات ستم تھرا رہے ہیں
حکومت کے علم تھرا رہے ہیں
غلامی کے قدم تھرا رہے ہیں
غلامی اب وطن سے جارہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آرہی ہے

نظم ''تاج'' سے مراد انگریزی حکومت کا شاہی تاج ہے۔ انگریزی حکومت کے ظلم وستم اور جبر وتشدد کو دیکھتے ہوئے کیفی نے تاج کی سخت لفظوں میں مذمت کی ہے مثال کے طور پر شعر پیش ہیں:

ہاں یہی تاج اسی تاجِ دُر افشاں کی قسم
حلقۂ جبر ہے محکومیٔ انساں کی قسم
شر کا عنوان ہے یہ جنگ کی تمہید ہے یہ
تیرگی جس سے برستی ہے وہ خورشید ہے یہ

کیفؔی کی اس نظم کا اندازِ بیان دلکش ہے لیکن سخت اور پر جوش ہے۔ اس تاج کی بربریت اور ظلم وستم کا احساس فیضؔ کی نظم ''ترانہ'' کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

نظم ''حقیقتیں'' کا موضوع سرمایہ دارانہ نظام ہے اس نظام کی بدعنوانیوں اور ناانصاف حاکموں کی کیفؔی نے سخت الفاظ میں مذمت کی ہے جس نے مظلوم عوام کی زندگی تلخ کردی ہے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی تنگ دستی، مفلسی، سودخوری جس کا شکار غلام اور غریب عوام ہیں اس کا اظہار دردانگیز اور پُراثر انداز میں کیفؔی نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر پیش ہے جس کا پہلا مصرعہ ظالموں کی خوش حالی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو دوسرا مصرعہ مظلوموں سے منسوب ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ان کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مصیبت کے سوا
میری دنیا میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

مظلوموں کو بغاوت پر آمادہ کرتے وقت کیفؔی کے لہجے میں جوش، ولولہ

اور امنگ سب بڑھا ہوا نظر آتا ہے مثال میں یہ شعر دیکھیں:

بڑھے جاتے ہیں شب و روز یہ سارے آزار
کہ علاج ان کا بغاوت کے سوا کچھ بھی نہیں

نظم ''آخری جنگ'' کا موضوع ہندوستان کی جدوجہد آزادی ہے اور مجاہدینِ آزادی کو کامل یقین ہے کہ یہ جنگ آخری جنگ ہوگی شاعر کا بھی تصور یہی ہے۔ ظلم وستم کو ختم کرنے، اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور ہمیشہ کے لیے فنا کردینے کے خیال سے تخریب اور توڑ پھوڑ سے بھی شاعر نے اتفاق کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال درج ذیل شعر ہے:

فنائے ظلم کے لیے اساس ظلم اکھاڑ دو
خزاں کو جو پناہ دے وہ باغ ہی اجاڑ دو

یہ نظم حقیقت کے اظہار، خیالات وتصورات اور موضوع ہر لحاظ سے عمدہ نظم ہے۔

نظم ''موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر'' کا موضوع فاشسٹ نظام اور مجاہدین آزادی ہے۔ انسانی طاقت ترقی پسند عناصر سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے اگر تمام انسان مجموعی طور پر یکجا ہوجائیں اور ان تمام خطرناک عناصر کا خاتمہ کرنا چاہیں، جن کا استعمال فاسشٹ طاقت کرتی ہے جیسے ہوائی فوجیں، بارودی سرنگیں، توپ خانے وغیرہ تو یہ آسانی سے کرسکتے ہیں۔ انہیں کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نظم انسان کی مجموعی طاقت کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ انہیں احساسات وخیالات کے تحت کیفی فخریہ انداز

میں کہتے ہیں:

ہماری قوتوں کا پوچھنا کیا
ہماری پشت پر ہے ایک دنیا
ہمارے ہاتھ میں ہے لال جھنڈا

نظم ''روسی عورت کا نعرہ'' کا موضوع روس پر فاسسٹ قوتوں کا دوبارہ حملہ اور روسی عورت کی نعرے بازی، شجاعت و بہادری، وطن سے اس کی بے لاگ محبت اور ملک کی خاطر ایثار و قربانی کے جذبات کا اظہار، کیفی نے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ روسی عورت کی حب الوطنی سے متعلق ایک شعر ملاحظہ ہو:

فضاؤں میں سرخی اچھالوں گی میں
وطن صاف تجھ کو بچالوں گی میں

کیفی کی یہ نظم دنیا کی تمام عورتوں کے لیے خصوصاً ہندوستانی عورتوں کے لیے سبق آموز ہے۔ جس سے کیفی کو بھی پوری طرح اتفاق ہے۔

نظم ''اعتراف'' کا موضوع نازی ایجنٹ اور لینن کی بیدار قوم ہے۔ اس نظم سے لینن اور اس کی بیدار قوم کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی بیداری اور ہوشیاری کا احساس نازی ایجنٹ کو بھی ہو جاتا ہے جو اس کو دوبارہ غلام بنانے کی خاطر روس میں داخل ہوتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

''ان میں سب خضر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیونکر''

نظم ''استقلال'' بھی روس کی غلام اقوام اور نازی درندوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم کا اصل مقصد بزرگوں کی غلط فہمی کو دور کرنا اور صبر و استقلال کی

اصل تعریف سمجھاتا ہے۔ جو نازی درندوں کو صبر و استقلال و پامردی کا حامل سمجھتے ہیں۔ کیفؔی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ استقلال کا مطلب غریبوں، مزدوروں کو کچلنا، انہیں تباہ و برباد کرنا نہیں ہے۔ جہاں کہیں استقلال ہوتا ہے وہاں انسانیت کے جوہر موجود ہوتے ہیں۔ اس لیے کیفؔی نے صاف صاف لفظوں میں کہا:

سن کہ استقلال جو ظلم میں آتا نہیں
تیغ کے سینے میں یہ جوہر نمو پاتا نہیں

یہ نظم موضوع اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بہتر ہے۔

نظم ''ساقی'' کسی خاص خصوصیت کی حامل نظم نہیں ہے۔ اس کا موضوع ساقی اور وہ درندے ہیں جو میخانے کو ڈھانے کی خاطر چڑھے چلے آتے ہیں جن کا مقابلہ شاعر پامردی کے ساتھ کرتا ہے۔ ایسی حالت میں ساقی کے ہاتھ میں شراب کی بوتل دیکھ کر شاعر غصہ اور نفرت کا اظہار کرتا ہے۔

نظم ''گورنر کی اسپیشل'' اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ برٹش حکومت ہندوستانی اقوام کی کسی بھی قسم کی دخل اندازی قطعی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کیفؔی کے الفاظ میں:

آگیا قانون کو کیفؔی جلال
تم نے ان بھیدوں کو پوچھا کس لیے

نظم ''گمراہ ولیعہد'' کا موضوع مغل بادشاہ کا آخری چراغ ہے جسے پھولوں کے بجائے کانٹوں کا تاج اپنے آباواجداد سے حاصل ہوا تھا۔ اور ہزار

کوشش کے باوجود وہ اس کانٹے کے تاج کو پھولوں کے تاج میں تبدیل نہ کر سکا۔

''گمراہ ولیعہد'' کے جذبات و احساسات، اس کی ناکامی و نامرادی وغیرہ کا ذکر بہت ہی دلکش انداز میں کیفی نے کیا ہے۔ اپنی ناکامی و نامرادی کا اعتراف ولیعہد خود کرتا ہے:

اپنی خاطر فرض انسانی بھلا سکتا نہیں
محترم بارِ وراثت میں اٹھا سکتا نہیں

ولیعہد کی ناکامی و مایوسی کو دیکھتے ہوئے ساحرؔ لدھیانوی اپنی نظم ''شہزادے'' میں اس کے آباواجداد پر طنز کرتے ہوئے ولیعہد کو اپنے گھروندے کے خلا میں کھو جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ساحرؔ کا شعر ملاحظہ ہو:

اپنے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور پھر اپنے گھروندے کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر بہت دیر بہت دیر تلک سوتے رہے

کیفیؔ کے یہاں مایوسی یا تھک کر بیٹھ جانے کا تصور کہیں نہیں ملتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کیفیؔ ساحرؔ کی طرح ولیعہد کو گھروندے کے خلا میں کھو جانے کا مشورہ نہیں دے سکے۔

نظم ''دستور بخشش'' کیفیؔ کی اشتراکی نظریات سے تعلق رکھتی ہے۔ بظاہر اس نظم کا تعلق ساقی کی تقسیم شراب کے طریقۂ عمل سے ہے لیکن اس کا حقیقی تعلق سرمایہ داروں، مطلق العنان حکومت، ملک کے امیرزادوں، ریاست داروں سے جو چھوٹے بڑے امیر و غریب میں تفریق کرتے ہیں انہیں خبردار

کرتے ہوئے سخت لہجے میں کیفی نے کہا:

نہیں پہنچانتا تیور ابھی تو تشنہ کاموں کے
ترا دستورِ بخشش لائقِ ترمیم ہے ساقی

نظم ''دھواں'' میں کیفی اعظمی نے برطانوی حکومت کے قائم شدہ کارخانوں، مشینوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو آسمان، ابر، اژدھے، زہر، بجلی وغیرہ سے مثال دے کر ظلم و ستم کی علامت قرار دیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

تاجروں کے لیے ابر و جود و عطا
اور محبت فروشوں کو قحط و وبا

آخر میں شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان مشینوں، کل کارخانوں سے ہر فرد کو بلا تفریق فائدہ پہنچنا چاہیے۔

نظم ''تاج محل'' میں کیفی اعظمی نے تاج محل کی شاندار و کشادہ عمارت کو بڑے چھوٹے، مالک و مزدور، حاکم و محکوم، راجا و پرجا کے درمیان تفریق کی علامت قرار دیا ہے۔ اس وجہ سے شاعر نے بار بار کہا:

دوست! میں دیکھ چکا تاج محل
۔۔۔واپس چل

اس نظم کے آخری بند سے کیفی کے اشتراکی نظریات کی عکاسی ہوتی ہے۔ بند ملاحظہ ہو:

دیدنی قصر نہیں دیدنی تقسیم ہے یہ
روئے ہستی پہ دھواں قبر پہ رقصِ انوار
پھیل جائے جو اس روضہ کا سمٹا دامن
کتنے جاندار جنازوں کو بھی مل جائے مزار
دوست میں دیکھ چکا تاج محل
واپس چل

کیفی کی طرح ساحر نے بھی ''تاج محل'' عنوان سے نظم لکھی ہے۔ ان دونوں شاعروں کے نزدیک تاج محل کی عمارت تفریح گاہ کے بجائے رنج وغم کی علامت ہے۔ تاج محل کو دیکھ کر چھوٹے بڑے امیر وغریب کی تفریق کا جو احساس کیفی کے بیان میں ملتا ہے وہ بڑی حد تک ساحر کے یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن دونوں کے تصورات اور انداز بیان میں فرق ہے۔ کیفی اس خیال سے رنجیدہ ہیں کہ کسی کا مقبرہ اتنی کشادہ زمین پر ہے اور کسی کو ایک بالشت زمیں بھی میسر نہیں۔ ساحر کو اس بات کا افسوس ہے کہ شاہجہاں بادشاہ نے تاج محل کی تعمیر کر کے غریبوں کی محبت کا مذاق اڑایا ہے۔ ساحر کا خیال ہے کہ دنیا میں ایسے تمام لوگ مل جائیں گے جنہوں نے سچی محبت کی ہے لیکن ان کی غربت نے انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی کہ بادشاہ کی طرح شاندار یادگار مقبرہ چھوڑ جائیں۔ بہت ہی درد انگیز لہجے میں ساحر نے کہا:

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے

لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے

نظم ''انتباہ'' کا موضوع مطلق العنان حکومت کے ظلم وستم، فاشسٹ نظام قائم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس نظم کی تخلیق کا خاص مقصد فاشسٹ نظام کے بڑھتے ہوئے خطرات سے ملک کو آگاہ کرنا، مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

چڑھے آتے ہیں وہ فاشی ہند کی بھی کھول دو مشکیں
سنو کچھ وقت کی آواز من مانی نہیں اچھی

نظم ''اتحادیوں کے نام'' کا موضوع انتباہ کی طرح فاشسٹ نظام اور ملک میں بڑھتی ہوئی اس کی قوت ہے۔ فاشسٹ قوتوں کے خاتمے اور اشتراکی نظام قائم کرنے پر شاعر نے زور دیا ہے۔

نظم ''جگاوا'' کا بھی موضوع فاشسٹ نظام اور اس کی بڑھتی ہوئی قوت، اس کا ظلم وستم ہے۔ جس کا اظہار کیفی نے بہت ہی درد انگیز لہجے میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہاں مٹتا ہوا حضرت آدم کا نشاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ

کیفی کے علاوہ نسل آدم کی بربادی وتباہی کا احساس ان کے ہم عصر شعرا میں ساحر لدھیانوی اور وامق جونپوری کے یہاں بھی اسی درد وکرب کے ساتھ ملتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نسل آدم کی حفاظت کے لیے کیفی نے ہندوستان کے نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور ساحر کے یہاں قدیم فلسفیوں سے زمانہ خود سوال کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسی تدبیر کیوں نہیں نکالتے کہ تمام بنی نوعِ انسان کی

حفاظت ہو سکے سب کو یکساں حقوق مل سکے۔ اس سے متعلق ساحرؔ کے دو اشعار پیش ہیں:

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانوں!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں

--

زمین نے کیا اسی کارن انجاج اُگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوا بلک بلک کر مرے
(نظم ''بنگال'')

وامقؔ جونپوری مارکسی نظام قائم کرنے پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

قوم کو جکڑے ہوئے ہے نجی سرمایہ کا حال
مارکسیت کے علاوہ ہے علاج اس کا محال

نظم ''روسی عوام اور جنگ'' کا موضوع ہٹلری نظام کی شکست اور روس میں اشتراکیت کا قیام ہے۔ یہ نظم روسی عوام کی بیدار مغزی آزادی، اور اشتراکیت کے قیام کی بہترین ترجمان ہے۔

نظم ''برما کا چاول'' خاص طور سے بنگالی اقوام کی بیداری، وطن کی خاطر قربانی و ایثار کے جذبات اور ان کے صبر و استقلال کی بہترین ترجمان ہے۔

نظم ''نئی صبح'' کا موضوع فاشسٹ نظام کی شکست اور اسٹالن کی فتح ہے۔ آزادی کی صبح اپنے ساتھ کس قدر خوشیاں لے کر نمودار ہوتی ہے اس کا اندازہ کیفی کی اس نظم سے ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ نظم منظر نگاری اور

جذبات نگاری کی بہترین مثال ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں:

شفق کی چادریں رنگیں فضا میں تھرتھراتی ہیں
اڑائے لال جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے
یہ سادہ سادہ گردوں پہ تبسّم آفریں سورج
پیارے کامیابی سے ہو اسٹالن مگن جسے

--

سحر کے آئینے میں دیکھتا ہوں حسنِ مستقبل
اتر آئی ہے چشم شوق میں کیفی کرن جیسے

--

کیفی اعظمی کے دوسرے مجموعۂ کلام ''آخرِ شب'' میں درج ذیل انقلابی، اشتراکی اور آزادی سے متعلق نظمیں شامل ہیں۔ جیسے سلام۔ ہم آگے بڑھتے ہی جارہے ہیں، نئے مہرباں، نئی جنت، تربیت، نئے خاکے، ہم، سوویت یونین اور ہندوستان، سپردگی، قومی حکمراں، سروجنی نائیڈو، حملہ، قومی اخبار، تاریکی میں، ناقص بھرتی، کرن، منظر خلوت، فیصلہ، تلاش، کب تک، آخری مرحلہ، مژدہ، آزادی، یلغار، فتح برلن، کرن، لال جھنڈا۔

نظم ''سلام'' کا موضوع بنگال کی مزدور یونین کی بغاوت ہے۔ ۱۸۹۰ء میں ہندوستان میں مزدور یونین کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں بمبئی میں باقاعدہ ٹریڈ یونین قائم ہوئی لیکن اس کے باوجود مل مالک اور سرمایہ دار

مزدوروں کا خون چوستے رہے اور ظلم و ستم ڈھاتے رہے۔ لہٰذا ۱۹۴۶ء میں کلکتے میں مزدور یونین نے بغاوت کردی۔ غرض یہ کہ مل مالکوں، سرمایہ داروں اور مزدور یونین کے درمیان کلکتے کی یہ بغاوت جسے کیفؔی نے شعری قالب عطا کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار بغاوت کا سانحہ ہے۔ کیفی کے الفاظ میں:

نہ بھولے گی نومبر کی وہ خونین داستاں برسوں
کرے گا ناز کلکتے پہ کل ہندوستاں برسوں

نظم ''ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں'' کا موضوع روسی عوام کے انقلابی جذبات ہیں۔ روسی عوام کی آزادی کی امنگ، جوش و خروش اور روشن مستقبل کے تصورات نہایت ہی پر کشش، دلکش اور پُر اثر انداز بیان کے ساتھ کیفؔی نے پیش کیا ہے۔ ایک خوبصورت شعر ملاحظہ ہو جس میں انقلابیوں کی پیشانی سے ٹپکتی ہوئی پسینے کی بوندوں کو چراغ کہہ کر حسنِ استعارے کی شکل میں پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے:

تری دہکتی ہوئی جبیں سے گری ہیں جتنی دہکتی بوندیں
چراغ اتنے ہی سرحدِ انقلاب پر جھلملا رہے ہیں

اس کے علاوہ روسی عوام کے انقلابی جذبات اور پختہ ذہنیت کی پوری اور بھرپور تصویر کیفؔی کے اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے:

نہ روک سکتی ہے خانہ جنگی نہ ٹوک سکتے ہیں سست رہبر
ہم انقلابی ہیں انقلابی، ہم آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں

نظم ''نئے مہرباں'' کا موضوع ملک کے وہ غدار ہیں جو آزادی ملنے کے قریب اپنے مفاد کی خاطر نئے مہربان کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ کیفی کو ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی غداری اور عیاری کا پورا احساس رہتا ہے، اس لیے کیفی کہتے ہیں:

ہم بدنصیب قدرِ کرم جانتے نہیں
دعویٰ بغیر جہد و عمل مانتے نہیں

یہ پوری نظم مکالماتی انداز میں کہی گئی ہے اور نئے مہربان سے طنزیہ لہجے میں طرح طرح کے سوالات کیے گئے ہیں کہ آخر ان کی اس قدر مہربانی کی وجہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انداز بیان دلکش، الفاظ کی شیریں، لہجے میں حد درجہ نرمی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

بے سمجھے دل کا حال ترس کھا رہے ہیں آپ
کس درجہ مہربان نظر آ رہے ہیں آپ

نظم ''نئی جیت'' کا موضوع انگریزی حکومت اور غلام عوام ہے۔ ہندوستان کی مظلوم قوم آزادی کے تصور میں کس قدر خوش اور نغمہ سنج ہے اس کا اندازہ کیفی کی اس نظم کے مطالعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

نظم ''تربیت'' کا موضوع غلام ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خیر خواہ اور ملک کے غدار رہنما ہیں۔ انگریزی حکومت کے خیر خواہ اپنی اولاد کو کس طرح کی تربیت دیتے ہیں۔ کیفی کی یہ نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ یعنی یہ لوگ خود ملک کے ساتھ غداری کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اپنی معصوم اولاد کو بھی غداری

کا درس دیتے ہیں۔ ان معصوم بچوں کی اس طرح کی درس و تدریس پر کیفی نے سخت رنج و غم کا اظہار کیا ہے:

اس سیہ آغوش میں تو پل رہا ہے ہائے ہائے
ظرف غداری میں بچپن ڈھل رہا ہے ہائے ہائے

شاعر کو یہ بھی یقین ہے کہ ان معصوم بچوں کو غداری کا موقع نہیں ملے گا۔ کیونکہ جب تک ہندوستان مکمل طور پر آزاد ہو چکا ہوگا۔

۱۹۴۴ء کا زمانہ قریب قریب ہندوستان سے غلامی کے خاتمے کا زمانہ تھا، انگریزی حکومت لڑتے لڑتے ہمت ہار چکی تھی اور صلح جوئی پر آمادہ تھی۔ گاندھی اور جناح ملک کی آزادی کے دو بڑے رہنما تھے لہٰذا اس کے اور برٹش حکومت کے درمیان آزادی کی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے خاکے کی تعمیرِ نو کی خاطر گاندھی اور جناح ملاقات کرتے ہیں۔ ان دونوں رہنماؤں کی ملاقات نے ملک کے ہر فرد کو بے چین و بے قرار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کی مدتوں کی محنت و مشقت، ایثار و قربانی کا صلہ ملنے والا تھا۔ کیفی کی نظم ''نئے خاکے'' فرد کی اسی بے چینی اور انتظار کی عکاسی کرتی ہے۔ اس وقت دونوں رہنماؤں سے عوام کی جو اپیل تھی کیفی نے اسے پُر اثر انداز میں بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے:

نقوشِ حسرت مٹا کے اٹھنا، خوشی کا پرچم اڑا کے اٹھنا
ملا کے سر بیٹھنا مبارک ترانۂ فتح گا کے اٹھنا
یہ گفتگو گفتگو نہیں ہے بگڑنے بننے کا مرحلہ ہے

کیفی کی نظم ''کرن''، ''نئے خاکے'' کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ یعنی

گاندھی اور جناح کی دوسری ملاقات میں بھی شرطیں منظور ہو جاتی ہیں۔ ملک میں دوستی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ کیفی کے الفاظ میں

ڈال دیں گرم تقاضوں نے گلے میں باہیں
آخری شرط بھی منظور ہوئی جاتی ہے

نظم ''ہم'' اس انسان کے جذبات کی بہترین ترجمان ہے، جسے اپنی طاقت اور کمزوری کا پورا پورا احساس ہے:

بے شک بچھڑ گئے تھے کبھی کارواں سے ہم
اے ہم رکاب اب جرس کارواں ہیں ہم

نظم ''سوویت یونین اور ہندوستان'' کی تخلیق کا مقصد ہندوستان کی غلام اقوام کو بیدار کرنا، ان کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ جیسا کہ سوویت یونین کی اقوام میں ہے۔ یہ نظم مکالمہ کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

نظم ''سپردگی'' کا موضوع جدوجہد آزادی ہے۔ نظم کافی طویل ہے۔ اس میں بھی ملک کے غدار رہنماؤں پر طنز ہے۔ مظلوموں کی شجاعت، بہادری، تباہی و بربادی وغیرہ کا ذکر ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل کی گئی نظموں میں ذکر ہو چکا ہے۔

نظم ''قومی حکمراں'' کا موضوع قومی حکمراں کی بے وفائی، غداری، عیاری ہے۔ ملک کے قومی حکمرانوں کی غداری اور عیاری پر کیفی نے بھرپور اور نرم لہجے میں طنز کیا ہے۔

نظم ''سروجنی نائیڈو'' کا موضوع خود سروجنی نائیڈو ہیں۔ کیفی نے ان

کی شخصیت کی تمام خوبیوں کو شعری قالب میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ ڈھال دیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

وہ خواب جھانسی کی رانی کو جس نے چونکایا
ترا جہاد مسلسل اسی کی ہے تعبیر

نظم ''حملہ'' کا موضوع بھی جدوجہد آزادی ہے۔ ملک کی کئی ریاستوں میں بغاوت شروع ہو چکی تھی۔ ریاست ٹراونکور کے مجاہدوں کے ترانے کے ذریعہ تمام عوام کو پر جوش لہجے میں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ترانے کا بھی وہی تصوّر ہے جو باقی تمام آزادی سے متعلق نظموں کا ہے۔

نظم ''قومی اخبار'' کا موضوع آزادی کے بعد ملک میں پھیلنے والی آپس کی کشیدگی اور تقسیم ملک ہے۔ آزادی کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے بڑے رہنماؤں جیسے گاندھیؒ، جناح اور نہرو کا کیا رویہ رہا۔ اس کی بھرپور عکاسی کیفی کی اس نظم میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

لیگ دیول کے اشارے پہ اٹھاتی ہے قدم
کانگریس دشمنِ اسلام ہے آصف کی قسم

نظم ''تاریکی ۱۹۴۵ء میں لاہور میں ہونے والے الیکشن کی روداد بیان کرنے اور مولانا آزاد و خضر حیات کی بے چینی اور ملاقات کی ترجمانی کے لحاظ سے اہم ہے۔

نظم ''ناقص بھرتی''، نظم ''تاریکی'' میں ہونے والے لاہور کے الیکشن کے نتیجے بیان کرتی ہے۔ جس میں حکومت کی باگ ڈور نااہل رہنماؤں کے

ہاتھوں میں پڑ جاتی ہے۔ اور حسبِ معمول ظلم وستم برقرار رہتا ہے۔

نظم ''منظر خلوت'' کا موضوع وہ بیوہ عورت ہے جو بیمار بیٹے کے علاج میں کچھ مدد کی غرض سے ایک دیندار بزرگ کے پاس جاتی ہے۔ بزرگ مدد کرنے کے بجائے اسے اپنی جنسی ہوس پرستی کا شکار بنالیتا ہے۔ کیفی ایسے لوگوں پر سخت افسوس، نفرت اور غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ جو بزرگی، پرہیز گاری، دینداری اور دیانت داری کی سند لے کر ظلم وستم ڈھانے اور دغا بازی کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر نظم کا آخری شعر پیش ہے:

تف ہے تجھ پر تف ہے زہد سفلہ خو
لوٹ لی اک بے زباں کی آبرو

کیفی کی طرح ساحر لدھیانوی اپنی نظم ''چکلے'' میں اس عورت کی بے کسی، مجبوری پر روشنی ڈالتے ہیں جس کی عصمت ریزی ایک شخص نہیں بلکہ باپ بیٹے اور تمام نوجوان کرتے ہیں۔ یعنی ایک عورت ماں، بیٹی، بہن اور بیوی سب کچھ ہوتی ہے۔ زمانے میں اس مظلوم عورت کی فریاد سننے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ لہٰذا ساحر مشرق کے تمام دیندار بزرگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثنا خوان تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟
بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ کیفی اور ساحر دونوں کی نظم اس معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں جو مرد وعورت کو اپنی جنسی ہوس پرستی کا شعار بنالیتا ہے، لیکن اس ظلم وستم کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

نظم ''فیصلہ'' کا موضوع ملک کے رہنماؤں کی وعدہ خلافی اور لاپرواہی ہے۔ آزادی کی خاطر عوام کی بے چینی اور تڑپ اور رہنماؤں کی غیر ذمے داری پر روشنی ڈالنا کیفی کا خاص مقصد ہے۔ جس میں وہ کامیاب ہیں:

قدم خود بڑھاتا ہے اب کارواں
اگر راہبر راہ پاتے نہیں

نظم ''تلاش'' کی تخلیق کا مقصد وہی ہے جو مندرجہ بالا نظم ''فیصلہ'' کا ہے۔ دونوں نظموں کی خصوصیات ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ قلعہ احمد نگر میں قید رہنماؤں سے شاعر اور مظلوم عوام کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں اور ان پر کامل یقین ہے۔

اب تک آزادی سے متعلق جتنی نظموں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں کہیں بھی کیفی نے جنگ آزادی سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا تھکن کا اظہار نہیں کیا ہے۔ نظم ''کب تک'' پہلی نظم ہے جس میں عرصہ سے ہو رہی طویل جنگ آزادی سے کیفی کچھ گھبراہٹ سی محسوس کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی تصدیق نظم کے آخری بند سے ہوتا ہے:

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک
کب تک آئین کی محتاط مذمت ہوگی

ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک
کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی

کیفی کی طرح وامق جونپوری کے یہاں بھی طویل غلامی اور جنگِ آزادی سے گھبراہٹ، تھکن اور مایوسی کا احساس ہے۔ جس کی تصدیق وامق کی نظم ''اس بار'' کے درج ذیل شعر سے ہوتی ہے:

کب تک یہ زمانے کی دیوی آرام سے محل میں سوئے گی
اور اس کے بے حس قدموں پر کب تک یہ جوانی روئے گی

نظم ''آخری مرحلہ'' کا موضوع جدوجہد آزادی ہے۔ جیسے جیسے ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آتے رہے ویسے ہی ویسے لوگوں کے آپسی اختلافات میں اضافہ ہوتا رہا۔ کیفی کی اس نظم کی تخلیق کا مقصد ان اختلافات کا خاتمہ اور عوام کو متحد کرنا ہے۔ لہٰذا پر جوش لہجے میں کیفی نے کہا:

مٹا دو دل کے مٹا دو نشاں غلامی کا
زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا

نظم ''مژدہ'' کامل آزادی ملنے کے امکانات پر خوشی و مسرت کا اظہار ہے، اسی لیے کیفی نے نظم کے آخری شعر میں کہا:

ہمارا قصۂ غم سن کے جن کا جی بہلتا ہے
قریب ختم آ پہنچی انہیں کی داستاں

نظم ''آزادی'' میں بھی آزادی ملنے کی امید میں ہر فرد بے حد مسرور نظر آتا ہے۔ شاعر نے ان کی خوشی، امنگ اور بڑھتی ہوئی طاقت کا اظہار موثر انداز

میں کیا ہے۔

نظم ''یلغار'' کا موضوع روس کی غلام قوم اور ہٹلر کا نظام ہے۔ روس کی فوجوں نے ہٹلر کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اس پر حملہ کر دیا۔ نازیت کی شکست اور روسی فوجیوں کے جوش اور ولولہ اور طاقت اور آزادی کی خوشی کے جذبات کی بہترین ترجمانی کیفی کی اس نظم میں ملتی ہے۔

قصر لعنت اب سنبھل سکتا نہیں
قصر لعنت ڈھا رہی ہے سرخ فوج
سوئے برلن جا رہی ہے سرخ فوج

نظم ''فتح برلن''، نظم ''یلغار'' کی دوسری کڑی ہے آزادی سے قبل روس کی غلام قوم فاشسٹ قوتوں کے ہاتھوں کس قدر تباہ و برباد ہو رہی تھی۔ کن مشقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا تھی اور اب آزادی کے بعد وہ کس قدر جوش میں ہے اس کی پوری تصویر کیفی نے بہت ہی خوبصورت اور مؤثر اور دلکش اندازِ بیان میں کھینچ دی ہے۔ جس کی مثال اور کہیں ملنی مشکل ہے۔

برلن کی یہ فتح کیفی کے نزدیک عالمی فتح ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

جشن یہ حوا کا ہے اور عید یہ آدم کی ہے
کارنامہ روس کا ہے فتح اک عالم کی ہے

نظم کافی طویل ہے اور کئی بندوں پر مشتمل ہے لیکن قاری کو طوالت کا احساس نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ کیفی کا خوبصورت اور حقیقی انداز بیان ہے۔

نظم ''لال جھنڈا'' کا موضوع کمیونسٹ پارٹی کا لال جھنڈا ہے۔ لال جھنڈے کی مخالفت کرنے والوں پر سخت غصہ اور نفرت کا اظہار کرتے ہوئے طرح طرح سے اس کی خصوصیات بیان کرنا کیفی کا خاص مقصد ہے۔ کیفی چونکہ مزدوروں، کسانوں، مظلوموں کے شاعر ہیں۔ اشتراکیت کے حامی ہیں، اسی لیے اس لال جھنڈے سے شاعر کو بے لاگ محبت ہے۔ نظم کے آخر میں وہ پر جوش لہجے میں کہتے ہیں کہ

نصب کر دیں گے اسے اک روز ہر دیوار میں
کارخانوں میں، ملوں میں، کھیت میں بازار میں

کیفی اعظمی کے تیسرے مجموعۂ کلام ''آوارہ سجدے'' میں درج ذیل انقلابی، اشتراکی اور آزادی سے متعلق نظمیں شامل ہیں جیسے فرغانہ، انتشار، مکان، آوارہ سجدے، ماسکو، لینن، دعوت، تلنگانہ، پہرہ، بنگلہ دیش، چراغاں۔

نظم ''فرغانہ'' کا موضوع عرصہ بعد ملنے والی فرغانہ کی آزادی ہے۔ جس کا خواب ایک زمانے سے کیفی دیکھ رہے تھے۔ اس کی تعبیر اب جا کر پوری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر نے فرغانہ کو ''میرے خوابوں کا وطن'' کہا ہے اور اس نظم کو ذریعہ بنایا ہے اپنی خوشی کے اظہار کا۔

نظم ''انتشار'' کا موضوع ملک کی تباہی و بربادی ہے چونکہ شروع سے کیفی کی فطرت نے دوسروں کے رنج وغم اور تکلیف کو ذاتی رنج وغم اور تکلیف سمجھنے پر مجبور کیا ہے۔ اس لیے یہاں پر بھی ملک کی تباہی و بربادی کو اپنی ذاتی تباہی و بربادی محسوس کرتے ہیں اور بے حد افسردہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا عوام سے

ان کی التجا ہے کہ کوئی بھی آگے قدم بڑھا کر انقلاب لائے۔ بہت ہی درد بھرے لہجے میں شاعر نے کہا ہے:

ہوئی تو کیسے بیاباں میں آکے شام ہوئی
کہ جو مزار یہاں ہے مرا مزار سا ہے

--

کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

نظم ''مکان'' میں کیفی اعظمی کے درد و کرب اور بے چینی و پریشانی کی وجہ وہ مظلوم مزدور ہیں جو رات دن محنت کر کے کوٹھیوں اور بنگلوں کو بناتے ہیں۔ لیکن ان غریبوں کی قسمت میں فٹ پاتھ ہے، ان مزدوروں کو برابر کا حق دلانے کی خاطر شاعر انہیں بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ بہت ہی درد انگیز اور پر اثر لہجے میں کیفی کہتے ہیں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

تیسرے مصرعہ میں تم بھی اٹھو تم بھی اٹھو کی تکرار سے نغمگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے مزدوروں کے ساتھ ساتھ شاعر خود بھی اٹھنا چاہ

رہا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے عیش و آرام کی زندگی کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک کہ فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والے مزدوروں کو سر چھپانے کو ایک مکان نہ مل جائے۔

نظم ''آوارہ سجدے'' کا موضوع کمیونسٹ پارٹی اور کیفی اعظمی ہے۔ کمیونسٹ اکائی کا ٹوٹنا، کیفی کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے جس کا اظہار انہوں نے بہت ہی درد انگیز لہجے میں یوں کیا ہے:

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہ نما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آ کے خدا کوئی نہیں

کمیونسٹ پارٹی سے کیفی کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں جیسے اشتراکی نظام کا نافذ ہونا اور ہر ایک کو مساوی حق ملنا وغیرہ۔ لہٰذا کمیونسٹ پاری کے ٹوٹنے کا غم کیفی کے لیے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معشوق کی جدائی کا غم ہو۔ یعنی جس طرح ایک عاشق، معشوق سے جدا ہو کر مرنے کی تمنا کرتا ہے اور قتل گاہ میں کسی قاتل کی تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح کیفی کو بھی اپنی قتل گاہ میں کسی قاتل کی تلاش ہے، لیکن حسب روایت کوئی قاتل مل نہیں پاتا اور آخر کار ایک سرد آہ کے ساتھ اپنی جگہ پہ واپس آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اک یہی سوز نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو! میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں

کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر نے اس نظم میں اپنے غم کا اظہار رومانی انداز میں کیا ہے جس کا تعلق دراصل سیاست سے ہے۔

نظم ''ماسکو'' کا موضوع روس کی آزادی ہے۔ اس نظم میں شاعر کا مقصد آزاد روس کی قوم کی خوشی و مسرت کا اظہار کرنے اور ان کے اشتراکی نظام کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔

نظم ''لینن'' کا موضوع لینن کی شخصیت ہے۔ لینن پر کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی دونوں شاعروں نے لینن ہی کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں اور دونوں کا مقصد اور موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی لین کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالنا۔ لینن صرف روس ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا رہنما تھا۔ کیفی کے الفاظ میں:

تم کو ہر ملک کی سرحد پہ کھڑے دیکھا ہے
اب کوئی ملک ہو تسخیر نہیں ہو سکتا

ساحر لدھیانوی فرماتے ہیں:

انساں کے مقدر کو آزاد کیا تو نے
مذہب کے فریبوں سے شاہی کے عذابوں سے

لینن کے اشتراکی نظام کی مضبوط دیواروں میں آج کیفی اعظمی کو ایک خطرناک شگاف نظر آرہا ہے۔ یعنی کمیونسٹ اکائی ٹوٹی جارہی ہے، اس لیے آج

بھی وہ اس کی حفاظت کی خاطر لینن کو پکارتے ہیں:

عہد پیچیدہ مسائل میں ہوا پیچیدہ
ان کو سلجھاؤ صحیفہ کوئی تحریر کرو

نظم ''دعوت'' کا موضوع آزاد ہندوستان میں کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے تنازعے نے قوم کو ایک عجیب بے چینی اور پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ سب سے پہلے کانگریس پارٹی نے مسلم لیگ کے خلاف اپنا رویہ بدلنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے رویہ میں بھی تبدیلی آنا لازمی تھا۔ غلطی چونکہ کانگریس پارٹی کی تھی اس لیے وہ مسلم لیگ سے گھبراہٹ محسوس کرتی تھی۔ اس کا اظہار کیفی نے یوں کیا ہے:

کوئی دیتا ہے درِ دل پہ مسلسل آواز
اور پھر اپنی ہی آواز سے گھبراتا ہے
اپنے بدلے ہوئے حالات کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے

آزادی حاصل کرنے کے بعد وقت کا تقاضا تھا کہ لوگ خوشیاں منائیں، لیکن مستقبل میں خطرہ لاحق ہونے کے احساس نے لوگوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ کانگریس پارٹی ہندوستان پر صرف اپنا حق سمجھتی تھی لیکن اس حق کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ کیفی نے بہت ہی خوبصورت انداز میں کہا ہے:

تری تقدیر میں آسائشِ انجام نہیں

اے کہ تو شورشِ آغاز سے گھبراتا ہے

غرض یہ کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ کیفی نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اسے شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ یہ کیفی اعظمی کا کمال ہے۔

نظم ''تلنگانہ'' کا موضوع جدوجہد آزادی ہے۔ مرد، عورت، بچے اور نوجوان سپاہی جس جوش وخروش کے ساتھ لڑ رہے ہیں اس کی حقیقی تصویر کیفی اعظمی کی اس طویل نظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نظم ''پہرہ'' کا موضوع سرحد پر چاروں طرف چھائی ہوئی دشمن کی فوج، سرحد پر لگی ہوئی دشمن کی فوجوں کی چالاکی، عیاری اور دغابازی شاعر کو پوری طرح احساس ہے۔ لہٰذا کیفی نے بلاخوف پر جوش لہجے میں صاف صاف الفاظ میں ان کی چالاکی اور دغابازی کا اعلان کر دیا:

ہم وہ راہی ہیں جو منزل کی خبر رکھتے ہیں

پاؤں کانٹوں پہ شگوفوں پہ نظر رکھتے ہیں

نظم ''بنگلہ دیش'' کا موضوع پاکستان کے صوبہ بنگال کی بغاوت ہے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے صوبہ بنگلہ دیش نے اپنے آپ کو آزاد ہونے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کی ہزار کوشش کے باوجود بنگال اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد بنگال پاکستان سے کس طرح مخاطب ہوتا ہے اور اپنی آزادی وبغاوت کو اپنا جائز حق سمجھتا ہے۔ کس طرح پاکستان اور اس کے درمیان جنگ ہوتی ہے۔

ان تمام واقعات کو کیفی اعظمی نے اپنے شعری الفاظ میں بنگال کی زبان میں بہت ہی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہار نہ ماننے کا چیلنج کرتے ہوئے بنگال پاکستان سے مخاطب ہے:

کتنے ناداں ہو تم
تم نے خیرات میں پائے جو ٹینک
ان کو لے کر میرے سینے پہ چڑھ آئے ہو

نظم ''چراغاں'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد بھی ملک میں بیکاری، بھوک، افلاس اور آپسی اختلافات موجود ہیں۔ جس کا کیفی کو شدید احساس ہے۔ ناامید ہونا کیفی کا شیوہ نہیں۔ اس لیے ابھی بھی وہ امید کے سہارے جی لیتے ہیں۔

کیفی اعظمی کے اسی تیسرے مجموعے ''آوارہ سجدے'' میں دیگر موضوعات سے متعلق درج ذیل نظمیں بھی ہیں جیسے نہرو، آخری رات، عادت، دائرہ، ابنِ مریم، دوپہر، بہروپنی، دوسرا طوفان، تاشقند، کھلونے، دھماکہ، زندگی، پیرتسمہ پا۔

نظم ''نہرو'' کا موضوع ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ کیفی اعظمی نے اس نظم میں ان کی شخصیت کی قصیدہ خوانی کی ہے۔ پُراثر انداز میں ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ وہ صحرا میں ایک چشمے یا سمندر میں ایک مینار کی روشنی کی مانند ہیں بظاہر وہ تمام لوگوں کے ساتھ تھے لیکن ذہنی طور پر ہمیشہ تنہا رہے۔ ان کی فکر اور ان کی ذہنیت اوروں سے بالکل مختلف

تھی۔ کیفی کے اس خیال کی تصدیق ان چند اشعار سے ہوتی ہے۔

جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینارِ نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا

--

وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا

نظم ''آخری رات'' کا موضوع ۱۹۶۲ء میں چین اور ہندوستان کے درمیان ہونے والی جنگ کی آخری رات ہے۔ یہ نظم اس رات کی پوری تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک طرح سے حقیقی منظر نگاری کی بہترین مثال ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

چاند ٹوٹا پگھل گئے تارے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے رات
پلکیں آنکھوں پہ جھکی آتی ہیں
انکھڑیوں میں کھٹک رہی ہے رات

نظم ''عادت'' کا موضوع حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے۔ یعنی مدتوں حضرت یوسفؑ کا کوئیں میں اسیر رہنا اور پھر اپنے آپ باہر نکلنا اور ان کی

خوبصورتی پر زلیخا کا عاشق ہونا، دامن پکڑ کر کھینچنا اور پھر دوبارہ حضرت یوسفؑ کو پریشانیوں میں مبتلا کر دینا وغیرہ ان تمام واقعات کو بہت ہی پر اثر انداز میں کیفی نے بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک بوڑھی زلیخا نہیں
جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسفؑ کا مول
لوگ بکنے کو تیار تھے

ہاتھ دامن تک آیا کوئی
دھجیاں دور تک بٹ گئیں

کیفی کی یہ نظم تاریخی حیثیت سے خصوصیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بڑے بڑے بزرگوں اور پیغمبروں کو بھی تکلیف پہنچانے میں لوگ قطعی گریز نہیں کرتے۔ اس احساس کی ترجمانی علی سردار جعفری اپنی نظم ''ایک پرانی داستان'' میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی حسین ہو کوئی مسیح یا سقراط
لہو کی پیاس انہیں ڈھونڈھتی ہی رہتی ہے

ہزار بار زمانے میں آئے ہیں یوسفؑ
ہزار بار بکے ہیں وہ مصر عالم میں

نظم ''دائرہ'' کا موضوع زندگی کا ایک ہی دائرے میں مقید رہنا ہے۔
انسان کی زندگی جس دائرے میں مقید ہے وہ دائرہ ایسا دائرہ ہے جس میں مصیبت، پریشانی، دکھ، درد کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس موجودہ صدی میں اگر انسان دو قدم آگے بڑھتا بھی ہے تو دوبارہ پھر وہیں آکر ٹھہر جاتا ہے۔ شاعر بار بار اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو پڑھتا ہے کہ شائد قسمت میں کچھ تبدیلی آگئی ہو۔ آخر میں شاعر اس قدر پریشان ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی میں انقلاب چاہتا ہے چاہے وہ جس شکل میں بھی ہو۔ شاعر کی اس گھبراہٹ و بے چینی کا نتیجہ یہ اشعار ہیں:

اپنے ہاتھوں کو پڑھا کرتا ہوں
کبھی قرآں کبھی گیتا کی طرح
چند ریکھاؤں میں سماؤں میں
زندگی قید ہے سیتا کی طرح
رام کب لوٹیں گے معلوم نہیں
کاش راون ہی کوئی آجاتا۔

نظم ''ابن مریم'' کا موضوع حضرت عیسیٰ اور زمانے میں پھیلے ہوئے ظلم وستم ہیں۔ حضرت عیسیٰ سے شاعر کو اس قدر عقیدت ہے کہ نظم کی ابتدا میں ہی شاعر نے پرجوش لہجے میں کہا ہے:

تم خدا ہو
خدا کے بیٹے ہو

یا فقط امن کے پیمبر ہو
یا کسی کا حسنِ تخیل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
مجھ کو سچے لگتے ہو

بمبئی کے ایک چبوترے پر حضرت عیسیٰ کے بنے ہوئے مجسمے کو شاعر علامت تصور کرتا ہے، امن وامان کی۔ دنیا میں تمام دیوتا، راکشش، امام اور پارسا پیدا ہوئے لیکن حضرت عیسیٰ کی طرح دوسرں کی خاطر خوشی سے سولی پر چڑھنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے شاعر نے کہا:

تم نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا

حضرت عیسیٰ کے مجسمے سے شاعر کی درخواست ہے کہ وہ بمبئی نہ رہ کر ایسی جگہوں پر مقیم ہو جہاں اس کی ضرورت ہے، جہاں امن وامان چاہیے۔ اسے ویت نام کے جنگلوں میں جانا چاہیے جہاں موت کا بازار گرم ہے۔ جہاں لوگ امن وامان کے طلبگار ہیں۔ اس لیے شاعر نے کہا:

جاؤ اک بار پھر ہمارے لیے
تم کو چڑھنا پڑے گا سولی پر

کیفی کی طرح حضرت عیسیٰ سے اس قدر عقیدت کا اظہار اب تک کسی اور شاعر نے نہیں کیا ہے۔ نظم کافی طویل ہے لیکن طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک ایک لفظ پُر تاثیر ہے۔

نظم ''دوپہر'' کا موضوع انسان کی لاپرواہی اور خودغرضی ہے۔ کیفی کی

یہ نظم زمانے کے ایسے لوگوں پر طنز ہے جو صرف اپنے آپ سے مطلب رکھتے ہیں۔ دنیا میں، اپنے ملک میں اور پاس پڑوس میں کیا ہو رہا ہے، اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

نظم ''دوسرا طوفان'' کا موضوع ملک کے بڑے بڑے ادیب اور رہنما ہیں۔ ملک میں کچھ ایسے ادیب پیدا ہوئے جو عوام کی بہتری کی خاطر لڑتے رہے، ادب تخلیق کرتے رہے لیکن زمانہ اسے بھی برداشت نہ کر سکا اور ایک دوسرا طوفان ان کی تباہی و بربادی کی خاطر کھڑا کر دیا اور ان کے ادبی سرمایہ کے خاتمے کی سازش کرنے لگے۔ شاعر کو یقین ہے کہ اس طوفان میں زمین ڈوبے گی نہیں بلکہ ابھر آئے گی:

یہ وہ طوفان نہیں ڈوب جاتی ہے جس میں زمیں
اس میں ڈوبی زمین ابھر آتی ہے

نظم ''تاشقند'' کا موضوع ۱۹۶۹ء میں تاشقند اور ہندوستان کے درمیان سمجھوتہ ہے۔ اس سمجھوتے سے کیفی بے حد خوش ہیں۔ خوشی کے جذبات کا اظہار دلکش اور پُر جوش لہجے میں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اشعار ملاحظہ ہوں:

جو کل مہماں تھے جو کل میزبان
گلے ملتے ہی ہو گئے جسم و جاں
غزل چھیڑ گھونگھرو پہن تاشقند
ترے ساتھ رقصاں ہے ہندوستاں

نظم ''کھلونے'' کا موضوع انسان کی بستی اور حکمرانوں کی نالائقیت

ہے۔دنیامیں آرام وآسائش کی تمام چیزیں آج بھی موجود ہیں، لیکن انسان اپنی کاہلی وسستی اور حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے پستی کے غار میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیفؔی نے دنیا کی تمام آرام وآسائش کی چیزوں کو کھلونے کے مماثل قرار دیا ہے۔موم کے چاک، پلاسٹک کی مشین وغیرہ۔مثال کے طور پر شعر ملاحظہ ہو:

اون کے تیر روئی کی شمشیر
صدر مٹی کا اور ربر کے وزیر

نظم ''دھماکہ''میں شاعر کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دھماکہ حقیقت میں تبدیل ہوکر زندگی کے نظام کو درہم برہم کردے۔ لہٰذا شاعر نے سب کو خبردار کیا ہے کہ:

گھر سے جب بھی نکلو باہر دوستو!
کچھ دھماکے بھر لو اپنی جیب میں

اس نظم کا مقصد امن وامان برقرار رکھنا ہے۔

نظم ''زندگی'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفؔی کو زندگی بہت عزیز ہے۔وہ اس زندگی کے خواہاں ہیں جو کبھی بھی ان کے دل کی دھڑکن کو بند نہ کر سکے۔ان کے لئے گوتم بدھ، حضرت عیسیٰ کے پاس گئے، اذان سن کر مسجد گئے لیکن کہیں بھی دائمی زندگی میسر نہ آئی۔ ہر جگہ امن وامان قائم کرنے کا پیغام ملا۔ دائمی زندگی کہیں نہ مل سکی اور مل بھی نہیں سکتی کیونکہ قدرت کا قانون ہے ایک نہ ایک دن زندگی کا خاتمہ ہونا ہے۔شاعر جس کو اپنا یہ سبق سکھانے چلا ہے اس نے اس کو سولی پر لٹکا دیا:

میں اٹھا جس کو اہنسا کو سبق سکھلانے

مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے

اس کے باوجود شاعر کو زندگی کس قدر عزیز ہے انہیں کے الفاظ میں:

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی

غم کا سرمایہ سہی

میں نے اس کے لیے کیا کیا نہ کیا

کبھی آسانی سے اک سانس یم راج کو اپنا نہ دیا

نظم ''پیر تسمہ پا'' میں دنیا کی ایجاد و ترقی اور مذہب وقوم کی فضول باتوں سے کیفی کو سخت نفرت اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اسے وہ جہالت تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن، انجیل اور وید کی تلاوت کو پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں:

میرے کاندھے پہ بیٹھا کوئی

پڑھتا رہتا ہے انجیل و قرآن و وید

مکھیاں کان میں بھنبھناتی ہیں

زخمی ہیں کان

کیفی کے مندرجہ بالا مصرعوں پر علما نے سخت اعتراض کیا ہے۔ بظاہر یہ اعتراض درست بھی ہے، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیفی کا مقصد مقدس مذہبی کتابوں کی بے حرمتی کرنا نہ ہو بلکہ ان علما و دانشوروں سے نفرت کی بنا پر ایسا کہا ہو جو وید، قرآن اور انجیل کے نام پر لغو باتیں کرتے ہیں۔

اقبال نے انقلابِ کو روس کے بعد اشتراکیت میں بے انتہا کشش

محسوس کی اور اردو شاعری کو ایک نئی اور خوبصورت انقلابی جہت سے آشنا کیا۔ اقبال کے یہاں یہ کشش وقتی نہیں تھی۔ ۱۹۱۷ء کے بعد سے ۱۹۳۸ء تک اس کا اظہار ان کی شاعری میں مسلسل ہوتا رہا۔ اقبالؔ کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کے سلسلے میں علی سردار جعفری فرماتے ہیں:

> ''اقبال کی نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کا شمار اقبال کی بہترین تخلیقات میں نہیں کیا جا سکتا''۔(''ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' از کیفی اعظمی پیش لفظ علی سردار جعفری، ص ۶)

لیکن اس کے بعد ہی اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے جعفری صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''اقبالؔ کی نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' اس اعتبار سے بہت زیادہ اہم نظم ہے کہ اقبالؔ کی تاریخی بصیرت نے ۱۹۳۶ء کے آس پاس یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایشیا میں سرمایہ داری، ملوکیت اور اشتراکیت کی جنگ میں اسلام کا شریک ہونا ضروری ہے۔(''ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' از کیفی اعظمی پیش لفظ علی سردار جعفری، ص ۱۷)

اقبالؔ کی نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' میں چار نظام ہیں شہنشاہیت، فاشزم، اشتراکیت اور اسلام۔ ان میں سے پہلے دو نظام ابلیس کی تخلیق ہیں اور

انقلاب کی زد پر ہیں اور متزلزل نظر آرہے ہیں۔ کلام اقبالؔ میں ابلیس ایک خاص سماجی مقصد کا علم بردار ہے۔ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' نظم جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ یہ ۱۹۳۶ء کی تخلیق ہے اور اقبالؔ کے مجموعۂ کلام ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے۔ لیکن اس سے قبل ان کے مجموعے ''بال جبریل'' میں جبرئیل و ابلیس کی عرضداشت نظمیں ملتی ہیں۔ جبرئیل و ابلیس میں جبرئیل سے ابلیس مخاطب ہے۔

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

لیکن پھر وہی ابلیس یہ بھی اعتراف کرتا ہے کہ:

''میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح''

جب کہ جبرئیل محض ''اللہ ہو'' کا وظیفہ پڑھتا ہے۔ ابلیس کی عرضداشت میں اقبالؔ ابلیس سے خدا کے حضور میں عرضی دلواتے ہیں کہ:

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اقبالؔ نے مغرب کی بورژوا جمہوریت دیکھی ہے جو ملوکیت کی علمبردار ہے۔ قوموں کے استحصال پر اس کی عمارت کھڑی ہے۔ اقبالؔ اسے بدلنے کی کوشش میں ہیں۔

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اقبالؔ اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ ایک

طرف سوشلسٹ انقلاب نے نئی افقوں سے روشناس کرایا اور اقبالؔ نے اسے تسلیم بھی کیا ہے، لیکن وہ اس سامراجی پروپیگنڈے سے بھی متاثر ہیں کہ روس میں مذہب ختم کردیا گیا ہے۔ اس لیے سوشلزم سے کچھ کھنچے کھنچے سے بھی ہیں۔ ابلیس کے مشیروں کی زبان سے اقبالؔ نے جو کچھ کہلوایا ہے وہ اسی کشمکش کا غماز ہے۔ پہلا مشیر کہتا ہے کہ جمہوریت کی وجہ سے کہیں ابلیس کے نظام کو خطرہ تو نہیں:

خیر ہے سلطانیِ جمہور کا غوغا کہ شر

دوسرا مشیر جواب دیتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس

تیسرا مشیر پوچھتا ہے:

'روح سلطانی' باقی ہے تو اضطراب کی گنجائش نہیں لیکن اس یہودی کارل مارکس کی شرارت کا کیا جواب ہے؟

وہ کلیم بے تجلی، وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ہے لیکن در بغل دارد کتاب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا تضاد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھے مشیر کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ ''رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں'' سے مسولینی کا جو فاشزم ابھر رہا ہے وہ ''اشتراکیت'' کا توڑ ہے یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ پہلے اٹلی میں اور پھر ۱۹۳۳ء میں جرمنی میں فاشزم ابھرا اور سوشلسٹ کو ختم کرنا اپنا دین و ایمان سمجھا تھا۔ ابلیس کو فاشزم پر بھروسہ ہے کہ وہ اس ''کارل

مارکس کے جگائے ہوئے فتنے" کو ختم کر سکتا ہے۔ ابلیس کو اگر کسی سے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ سچا مومن ہے۔ اس لیے ابلیس نے کہا کہ جمہوریت سے خطرہ ہے نہ اشتراکیت سے، اصل خطرہ (اقبالؔ کا ضمیر بول رہا ہے) سچے مسلمانوں سے ہے۔ مردِ مومن سے ہے۔ لہٰذا ابلیسی نظام کو باقی رکھنے کے لیے مومن کو مومن نہیں بننے دینا چاہیے۔ اسے ترکِ دنیا کی تعلیم میں مست اور خانقاہوں میں مشغول رکھنا چاہیے۔ اس پر جہاد کی ممانعت کر دینی چاہیے اور غلامی کا عادی بنا دینا ہے۔ وہ رسوم و قیود کا پابند رہے اور اجتہاد سے دور رہے۔

یہ اقبال ۱۹۳۶ء میں کہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اشتراکیت اور انقلابِ روس کا استقبال بھی کیا ہے اور کہا ہے:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

--

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبالؔ بشارت دیتے ہیں کہ مشرق و مغرب میں مزدور کے دور کا آغاز ہے اور پھر خدا سے فرشتوں کو حکم دلواتے ہیں:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوا رہلا دو

اقبالؔ کی شاعرانہ روح نے اشتراکیت کے نور کو محسوس تو کر لیا تھا، لیکن

روئے زمین پر انسانی سماج کو اس نے جو بلند مقام عطا کیا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ سکی۔ یعنی مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبالؔ کو جہاں اسلام پر ایمانِ مستحکم تھا وہیں سوشلزم کے تعلق سے ان کا رویہ ہمدردانہ بھی تھا۔

کیفیؔ اعظمی کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کا دوسرا اجلاس '' کن تاثرات کے تحت تخلیق ہوئی۔ کیفیؔ نے اپنے بیان میں صاف صاف اس کی توجیہ کردی ہے۔ یعنی آج سے ۳۰۔۳۵ برس پہلے کیفیؔ نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبالؔ کی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کا مطالعہ کیا تو اس سے بے حد متاثر اور مرعوب ہوئے۔ لیکن بعد میں جب تاریخ کی ٹھیک وہی رفتار نہیں رہی جس کی ابلیس نے پیشن گوئی کی تھی تو بار بار کیفیؔ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ابلیس کا دوسرا اجلاس بلائیں اور اس کی روداد قلم بند کریں۔ لیکن اقبالؔ کے لہجے اور آہنگ نے انہیں اس قدر مرعوب کر رکھا تھا کہ قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ دوسرے کیفیؔ کو اس بات کی بھی جھجک تھی کہ کہیں ان کا شمار لکھنؤ کے ان شاعروں میں نہ ہونے لگے، جنھوں نے شکوہ کے جواب میں لمبی لمبی نظمیں لکھیں۔ علی سردار جعفری نے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' کا پیشِ لفظ لکھ کر کیفیؔ کے ڈر اور جھجک کو ختم کر دیا اس کا اعتراف کرتے ہوئے کیفیؔ خود فرماتے ہیں کہ:

> ''جعفری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے پیش لفظ میں یہ بات صاف کردی ہے کہ یہ نظم اقبالؔ کا جواب نہیں ہے۔ یہی سچ بھی ہے''۔ (ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا دوسرا اجلاس، کیفیؔ اعظمی بیانِ صفائی، ص ۵)

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر جب فسطائیت اور نازی ازم نے سوشلزم کے ہاتھوں فیصلہ کن شکست کھائی تو کیفؔی اور ساحؔر لدھیانوی دونوں شاعروں نے منصوبہ بنایا کہ مل کر ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس لکھیں لیکن وہ منصوبہ بہت سے سرکاری منصوبوں کی طرح کاغذ ہی پر رہا۔ اسی زمانے میں بیروت میں فلسطینی مجاہدوں کے قتل عام نے کیفؔی کے ضمیر کو اس طرح جھنجھوڑا کہ وہ نظم لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

لہٰذا اقبالؔ کی مجلس شوریٰ کے ۴۷ سال بعد کیفؔی اعظمی نے سوچا کہ اگر اقبالؔ ہوتے اور ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس منعقد ہوتا تو ابلیس اور ان کے مشیروں کے درمیان کیا بات ہوتی؟ ابلیسی نظام کے برقرار رکھنے کے لیے ابلیس کے پاس اب کیا نئے ہتھیار ہوتے۔ سوشلزم پر اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب وہ ایک تابدار حقیقت ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت، زوال کی منزلوں میں ہے۔ اس کے عوض میں سوشلسٹ جمہوریت ہی ہے جو پروان چڑھ رہی ہے۔ سوشلزم جسے اقبالؔ کے ابلیس نے قابلِ اعتنا بھی نہیں سمجھا تھا۔ آج وہ کسی طرح پوری دنیا کے افق پر چھا رہا ہے۔ اس سلسلے میں کیفؔی رقم طراز ہیں:

> ''میں دیکھ رہا ہوں اور میری طرح ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ سوشلزم، اقبالؔ کے ابلیس نے جس کو قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھا تھا اور جس کا توڑ اس نے فسطائیت میں دیکھا تھا آج وہ نظریۂ حیات فاتحانہ پورے عالم انسانیت کو اپنی باہوں میں سمیٹے لے رہا ہے''۔ (ابلیس

کی مجلس شوریٰ" کا دوسرا اجلاس، کیفی اعظمی بیان
صفائی، ص ۵)

کیفی اعظمی کی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس اگر ایک طرف اقبال کی نظم کا تسلسل ہے تو دوسری طرف ارتقا بھی ہے۔ کیفی نے اقبال کے بعد سے آج تک اشتراکیت کے ارتقا کی منزلوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ابلیس ۱۹۸۳ء میں کہتا ہے کہ:

ہو گیا کس طرح انساں ہم سے اتنا منحرف
اس کے کانوں میں نہ جانے کس نے پھونکا یہ فسوں

ابلیس کی بے بسی قابلِ ملاحظہ ہے۔ انسان نے ابلیسی نظام پر اپنی برتری ثبت کر دی ہے۔ پہلا مشیر ابلیس پر بڑی ہمت سے وار کرتا ہے:

تیری نخوت جس کو خاطر میں کبھی لاتی نہیں
ناسمجھ یہ سب اسی مرد یہودی کا ہے کام

فاشزم کو شکست فاش ہوئی اور اس پر اقبال کے ابلیس نے تکیہ کیا تھا۔ تیسرا مشیر دوسرے اجلاس میں کہتا ہے:

روس اک کوہِ حقیقت ہے بساط ارض پر
ریزہ ریزہ ہو گیا ٹکرا کے جس سے تیرا خواب

ابلیس کو اب بھی ماؤوادی چین اور امریکہ کے ایٹمی ہتھیاروں پر بھروسہ ہے کہ وہ اشتراکیت پر بھرپور وار کر کے اسے تباہ کر سکتے ہیں:

روس سے دست و گریباں ماؤوادی چین ہے
دولگا سے بدگماں پولینڈ کی ہے آبجو

ہو رہا ہے آئے دن تازہ تضادوں کا ظہور
ہے زوال آمادہ لینؔن کا جہان آرزو

لینؔن پانچواں مشیر منہ توڑ جواب دیتا ہے۔

یہ تضادوں کا تصادم ہے ترقی دلیل
اپنی نافہمی سے سمجھا ہے جسے بحران تو
پہلے تنہا روس تھا اب اس کے ساتھی ہیں کئی
اور ہر ساتھی کو اپنی راہ کی ہے جستجو
کیوں فروغِ اشتراکیت سے تو ہے دردمند
اب ہیں مسلم بھی اس پرچم کے نیچے سربلند
مصر کو کیا دیکھتا ہے دیکھ سوئے تاشقند

اس کے بعد ابلیس امریکہ کے ایٹمی لوگوں کے ڈھیر کا حوالہ دیتا ہے اور پانچواں مشیر بول اٹھتا ہے:

ویتنامی جنگلوں میں جس کے ناخن رہ گئے
کیسے سمجھے جارہا ہے اب بھی تو اس کو دلیر
کاخِ واشنگٹن سے ٹکرانے لگا سیلاب امن
اس سے زندہ پار اتر سکتا نہیں کاغذ کا شیر

پھر آخر میں غیب سے آواز آتی ہے:

مجلس آرائی کی فرصت بھی نہیں تجھ کو اجازت بھی نہیں

اور پانچواں مشیر اعلان کرتا ہے:

وقت کا اعلان سن کر اس طرح تو منہ نہ پھیر
مجلس شوریٰ کو کر برخواست اس میں کر نہ دیر

غرض یہ کہ کیفی نے یہ نظم لکھ کر ایک طرح سے اقبالؔ نے جوبات شروع کی تھی اسے سماج عالم کے ارتقا کے پس منظر میں مکمل کیا ہے اور یہ بڑا ادبی کارنامہ ہے اور کیفی کی شاعری میں کامیاب فتحیاب اور تازہ شاہکار نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ کا دوسرا اجلاس'' ہے۔ مارکسزم، لینن ازم، عصر حاضر کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور فتح مند نظریہ ہے۔ کیفی کی یہ نظم نظریاتی پختگی اور فتح مند نظریہ کی کامیابی راسخ العقیدہ کی مشاہدہ ہے۔

کیفی اعظمی کی رومانی نظمیں

کیفی اعظمی کے پہلے مجموعۂ کلام ''جھنکار'' میں درج ذیل رومانی نظمیں شامل ہیں۔ جیسے مغنیہ، بانسری کا لہرا، کہرے کا کھیت، برسات کی ایک رات، دوشیزہ مالن، شام، منتیں، سویرے سویرے، اللہ رے شباب کا زمانہ، معذرت، رقصِ شرارہ، پہلا سلام، تجربے، اخفائے محبت، گلدستہ، الجھنیں، عورت۔

نظم ''مغنیہ'' کا موضوع شام کا وہ خوشنما منظر اور اس منظر میں گاتی ہوئی ایک مغنیہ جو تمام کائنات کو بےخودی کے عالم میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ خدائی بھی ہچکولے کھانے لگتی ہے:

زمانہ مسحور ہو رہا تھا خدائی ہچکولے کھا رہی تھی

مغنیہ کی طرزِ ادا اور شام کے منظر کو کیفی نے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر خود اس قدر متاثر ہے کہ بار بار اس شام کے آنے کی تمنا کرتا ہے۔ یہ نظم خالص رومانی اور روایتی ہے اور کسی خاص خصوصیت کی حامل نہیں۔

نظم ''بانسری کا لہرا'' میں خاص طور سے چاندنی رات کے قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔اس نظم کا موضوع چاندنی رات میں کسی کا بانسری بجا کر قیامت ڈھانا اور شاعر کو کسی کی یاد آنا، دل کا بیٹھنا ہے۔شاعر کو کسی کی یاد آتی ہے۔اس جانب کوئی اشارہ نہیں۔شاید محبوبہ کی یاد ستاتی ہوگی:

نہ جانے کیوں ہر اک میٹھی نوا پر
دل ناکام بیٹھا جا رہا ہے
کسی کی شکل پھرتی ہے نظر میں
کوئی بھولا ہوا یاد آرہا ہے

اس طرح نظم ''کہرے کا کھیت'' میں بھی شاعر کو ٹرین کے سفر میں کسی کی یاد ستاتی ہے۔اس نظم کا موضوع ٹرین کا سفر جاڑے کی رات چاروں طرف کہرا ہی کہرا، چاند تارے چھپے ہوئے چہار جانب دریا ہی دریا نظر آتا ہے۔

اس نظم کا موضوع بظاہر عشقیہ معلوم ہوتا ہے لیکن کسی سے بچھڑنے اور صدمہ اٹھانے سے مراد صرف محبوب ہی نہیں ہوسکتا، اس کی وجہ وطن کی غلامی کی زندگی، ظالم حکومت کے ہاتھوں قید و بند کی سزائیں بھگتنا، ساتھیوں، مظلوموں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا وغیرہ ہوسکتا ہے۔اس نظم کا تعلق رومانی اور سیاسی دونوں ہوسکتا ہے اور دونوں لحاظ سے نظم اعلیٰ درجے کی ہے اور حقیقی جذبات کی ترجمان ہے۔

نظم ''برسات کی ایک رات'' منظر نگاری کے اعتبار سے خوبصورت ہے اور عاشق کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے بھی عمدہ ہے۔لیکن موضوع

اور شاعر کے احساس جذبات کے لحاظ سے روایتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

بھڑکتا ہے رہ رہ کے سوزِ محبت
جھما جھم برستا ہے پرشور پانی

--

کہیں اور جاکر برس مست بادل
خدا تیرا دامن جواہر سے بھر دے

نظم ''دوشیزہ مالن'' کا موضوع صبح کا خوبصورت منظر، دوشیزہ مالن کی تعریف پھر اس سے محبت کا اظہار۔ موضوع اور اندازِ بیان دونوں لحاظ سے نظم روایتی ہے لیکن کیفؔی کا اندازِ بیان نہایت دلکش ہے:

اے حور باغ، اتنی خودی سے نہ کام لے
اڑ کر شمیمِ گل کہیں آنچل نہ تھام لے
کلیوں کا لے پیام، سحر کا سلام لے
کیفؔی سے حسن دوست کا تازہ کلام لے

اس کے بعد پھر کیفی نے کہا:

شاعر کا دل ہے مفت میں کیوں دردمند ہو
اک گل ادھر بھی نظم اگر یہ پسند ہو

خاص طور پر اس شعر کا پہلا مصرعہ توجہ طلب ہے شاعر کا دل مفت میں دردمند نہیں ہوتا۔ کیفی کا یہ تصور روایت سے ہٹ کر اور ان کے ہم عصر تمام رومانی

شعرا سے مختلف اور جدید ہے۔

نظم ''شام'' منظر نگاری اور محبوبہ کی یاد دونوں لحاظ سے روایتی ہے۔

''منتیں'' میں کیفی کی شاعری اور نغمگی کا عنصر محبوبہ ہے، روایتی طور پر نظم میں عشق و محبت کی واردات پیش کی گئی ہے جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے کہ عاشق معشوقہ کی منت سماجت کرتا رہتا ہے اور وہ ناز و ادا دکھاتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

عنصر شاعری نہ جا، نغمۂ سرمدی نہ جا

چھوڑ کے مجھ کو جاں بلب اے میری زندگی نہ جا

اس نظم کا اندازِ بیان دلکش ہے۔ محبوبہ سے منت سماجت کرنے کا ڈھنگ انوکھا اور نرالا معلوم ہوتا ہے، جو باقی تمام رومانی شعرا کے یہاں کمیاب ہے۔

نظم ''منتیں'' کے بعد نظم ''سویرے سویرے'' کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''سویرے سویرے''، ''منتیں'' کا جواب ہے۔ یہ دونوں نظمیں ایک وقت کی تخلیق معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم ''منتیں'' میں جس محبوبہ کی منت سماجت کی جا رہی تھی کہ رک جائے وہی محبوبہ نظم ''سویرے سویرے'' میں عاشق کا دل بے دردی سے توڑ کر چلی جاتی ہے، جس کا اظہار کیفی نہایت درد انگیز لہجے میں کرتے ہیں:

ابھی تک مری انگلیاں کانپتی ہیں

کچھ اس طرح دامن چھڑا کر سدھاری

نظر اٹھ ہی جاتی ہے اس سمت کیفی
جدھر وہ نگاہیں جھکا کر سدھاری

''اللہ رے شباب کا زمانہ'' کا موضوع محبوبہ کا شباب، اس کا گھمنڈ، نرالی و انوکھی چال، طرح طرح کی ادائیں دکھانا وغیرہ ہے۔ اس نظم میں محبوبہ کی تمام خصوصیات کا ذکر شاعر نے قصیدہ خوانی کے انداز میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ محبوبہ کے غرور و گھمنڈ سے متعلق کیفی اور ساحر لدھیانوی دونوں کے خیالات میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ کیفی کی محبوبہ اپنے شباب کے غرور میں ہونے کی وجہ سے عاشق کی طرف نگاہِ التفات نہیں کرتی۔ اور ساحر کی نظم ''شکار'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبوبہ کو گاڑی، موٹر کار اور بنگلہ چاہیے۔ ساحر نے موجودہ زمانے کی دوشیزہ پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ساحر کے شعری الفاظ میں:

مگر ہاں بنچ کے بدلے اسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میرے بجائے ایک چمکتی کار دکھلا دے

کیفی کی نظم ''معذرت'' کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''منتیں'' اور ''سویرے سویرے'' کی بے وفا محبوبہ اب عاشق سے وفاداری برتنے لگی ہے کیونکہ عاشق کے حسب وعدہ نہ آنے پر محبوبہ پریشان ہو کر روٹھ جاتی ہے پھر عاشق کہتا ہے:

مرے حسب وعدہ نہ آنے سے شاید
ہوئی حسرت و شوق کی پائمالی

--

نہ کر اب خدا را زیادہ پشیماں

کہ آخر ہوں اک شاعر لاابالی

اچانک دونگاہوں کے ملنے سے کس طرح عشق ایک شرارے کی شکل میں پھیلتے ہوئے جبیں، عارض، لب او رباہوں سے گزرتا ہوا دل تک جا پہنچتا ہے۔ اس کیفیت کو بہت ہی پُراثر انداز میں کیفؔی نے اپنی نظم ''رقصِ شرارہ'' میں پیش کیا ہے۔ یہی نظم کی خصوصیت ہے۔

نظم ''پہلا سلام'' میں محبوبہ کے پہلے سلام پر عاشق گھبرا جاتا ہے اور جواب نہ دے کرعشق کی ناکامی پر افسوس کرتا ہے:

رہ گیا عمر بھر کے لیے یہ حجاب

کیوں نہ سنبھلا ہوا دے سکا میں جواب

کیفؔی کے برعکس ''اختر شیرانی'' جھجک کر خاموش نہیں رہتے بلکہ محبوبہ کی مدح کرتے ہوئے سلام کا جواب پیش کرتے ہیں اور اپنی نذرِ محبت قبول کرنے کی التجا کرتے ہیں:

امیدوں کی کلی کھل کے پھول ہو جائے

ہماری نذرِ محبت قبول ہو جائے

کیفؔی کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ محبوبہ کے فراق کے غم کو کوئی بھی خوشی ختم نہیں کرسکتی اگر تھوڑی دیر کے لیے سکون مل بھی جائے تو اس سے تسکین نہیں ہوتی کیونکہ مستقبل سے شاعر آگاہ ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر وصلِ یار ہو بھی تو چند لمحوں کے لیے بیکار ہے۔

نظم ''اخفائے محبت'' یوں تو عشقیہ نظم ہے لیکن اس عشقیہ نظم میں کیفی نے اپنے جو خیالات و تصورات پیش کیے ہیں وہ بالکل نئے اور تمام شعرا کے عشقیہ تصورات سے بالکل مختلف ہیں۔ کیفی کا یہ خیال بجا ہے کہ معاشرے کے خوف یا ڈر سے اپنی محبت کو چھپانا نہیں چاہیے۔ کھلے عام محبت کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بنی نوع انسان کا خون چوسنا، مندر مسجد اور مذہب کی آڑ لے کر ظلم ڈھانے سے بہتر ہے عشق و محبت کرنا۔ بہت ہی پُر اثر انداز میں کیفی نے کہا ہے:

ظلم تم نے کوئی ڈھایا تو نہیں
ابن آدم کو ستایا تو نہیں
خوں غریبوں کا بہایا تو نہیں
یوں پسینے میں نہاتی کیوں ہو؟
تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

کیفی اپنی محبوبہ کو کھلے عام محبت کرنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن بہت ہی سنجیدگی و ہمدردی کے ساتھ۔ ان کے برعکس ساحر بہت ہی سخت لہجے میں محبوبہ سے کہتے ہیں:

جب تمھیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر میری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

یعنی کھلے عام عشق و محبت کرنے کے تصورات دونوں کے یہاں ایک

ہی جیسے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ کیفؔی کے لہجے میں نرمی ہے اور ساحؔر کے لہجے میں تلخی۔

نظم ''اخفائے محبت'' کے آخری بند کے پہلے شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر کیفؔی کے تصورات فیض احمد فیضؔ سے ہم آہنگ ہیں۔یعنی عشق ومحبت کی باتیں کرتے کرتے ایک دم کیفؔی کو خیال آجاتا ہے ملک کی آزادی کا۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں:

آؤ اب گھٹنے کی فرصت ہی نہیں

او ربھی کام ہیں الفت ہی نہیں

فیض احمد فیضؔ کہتے ہیں:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

نظم ''گلدستہ'' یوں تو رومانی نظم ہے لیکن اس نظم میں عشق ومحبت کے ساتھ ساتھ شاعر نے زمانے کی تباہی و بربادی کی بھرپوری عکاسی کی ہے۔عوام کی، ملک کی تباہی و بربادی نے شاعر کی تمناؤں، خواہشوں کو ختم کردیا ہے۔اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کی خوشی کے آگے شاعر کی ذاتی خوشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔بہت ہی پُراثر انداز میں کیفؔی نے کہا ہے کہ:

افلاس گزیدہ شاعر یہ رنگین مشاغل کیا جانے

الفت کے گلابی پھندوں کو پابندِ سلاسل کیا جانے

نظم ''الجھنیں'' اس اعتبار سے خصوصیت کی حامل ہے کہ اس میں عاشق ومعشوق دونوں کے جذباتِ محبت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ملک کی تباہی و بربادی نے عاشق کو اس قدر بے چین کر رکھا ہے کہ عاشق چاہتے ہوئے بھی محبوبہ کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔ ادھر محبوبہ پریشان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ عاشق اس سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ الجھن اس بات کی ہے کہ عاشق اپنی پریشانیوں کا راز محبوبہ پر فاش نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ کیفؔی کہتے ہیں:

مجھے فرصت نہیں رنگینیوں میں ڈوب جانے کی
اسے دیتا ہے دھوکا اعتبار انتخاب اس کا
حقیقت مست آنکھوں کو دکھاؤں کس طرح کیفؔی

اس قسم کی الجھنوں میں جاں نثار اخترؔ بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کو بھی عشق ومحبت سے زیادہ غم دوراں کا پاس ہے۔ اخترؔ کو اس بات کا خوف بھی ہے کہ ان کا فن جو عشق ومحبت سے پروان چڑھا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ غم دوراں کی فکر ونظر سے انہیں جدا کردے۔ چنانچہ اخترؔ کہہ اٹھتے ہیں کہ:

یہ تیری نیم نظر کا متبسم جادو
میرے دل سے غم دوراں کا اثر چھین نہ لے

کیفؔی کی نظم ''عورت'' بھی رومانی نظم ہے، لیکن اس نظم میں کیفؔی کا رومانی تصور ان کے تمام ہم عصر شعرا سے بالکل مختلف ہے۔ کیفؔی کے نزدیک عورت جسمانی، دماغی، ذہنی کسی بھی طرح سے کمزور نہیں وہ جدوجہدِ آزادی میں حصہ لے سکتی ہے اور جنگ کے میدان میں مردوں کی طرح مقابلہ کرسکتی ہے۔ چنانچہ کیفؔی

اپنی محبوبہ کو اپنے ساتھ ساتھ چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

عورت سے متعلق جاں نثار اخترؔ کے تصورات کیفیؔ کے تصورات سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں لیکن اخترؔ کے یہاں کیفیؔ کی طرح کھل کر یہ بات سامنے نہیں آتی کہ عورت بغاوت کے میدان میں ساتھ ساتھ چلے۔ رمزیہ انداز میں اختر کہتے ہیں:

تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارہ بن جا
تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارہ بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

اخترؔ کی نظم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اختر شیرانی اور کیفیؔ کے یہاں عورت سے متعلق جو تصورات ہیں ان میں بہت فاصلہ ہے۔ اخترؔ شیرانی عورت کی طاقت کو تسلیم تو کرتے ہیں لیکن ان کی نظر میں عورت اپنی طاقت کا استعمال صرف گھر کے اندر کرسکتی ہے۔ عورت کی شخصیت کو اس حد تک طاقتور محسوس کرتے ہیں کہ وہ چاہے تو تمام کائنات کو تبدیل کردے۔ چاہے تو تمام کائنات پر شان کے ساتھ حکمرانی کرے۔ بغیر کسی فوجی لشکر کے بغیر کسی خنجر کے۔ یعنی اخترؔ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورت اپنی خوبصورتی، نزاکت، حسن و ادا کی بنا پر کائنات پر حاوی ہے:

جہاں میں کرتی ہے تباہی مگر لشکر نہیں رکھتی
دلوں کو کرتی ہے زخمی مگر خنجر نہیں رکھتی

اخترؔ شیرانی کی دوسری نظم ''عورت اور پردہ'' کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی روایتی طور پر عورت کو جسمانی لحاظ سے ناز اور کمزور سمجھتے ہیں۔ اور اس کی دلفریبی، خوبصورتی لطافت کی بنا پر پردہ میں رہنا ہی اس کے لیے بہتر تصور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب ہر ایک طرف لطافت ہے نہاں پردے میں
پھر برا کیا ہے جو عورت ہے نہاں پردے میں

غرض یہ کہ کیفیؔ کے ہم عصر تمام شعرا کے یہاں عورت کا تصور کافی حد تک روایتی ہے۔ صرف کیفیؔ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے عورت کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسے اس کی آزادی کا پورا پورا حق دلانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے مردوں کے مقابل باہر نکلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیفیؔ کی نظم ''عورت'' کی یہ سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت ہے۔

کیفی کے دوسرے مجموعۂ کلام ''آخرِ شب'' میں درج ذیل نظمیں شامل ہیں۔ تجدید، حوصلہ، تبسم، نرسوں کی محافظ، تم، تصور، دوراتیں، ملاقات، پشیمانی، مجبوری، نقش و نگار، اندیشے، نصیحت، احتیاط۔

کیفیؔ اعظمی کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ اکثر وہ اپنے آپ کو عشق و محبت میں بالکل ناکام پاتے ہیں اور ایک دم مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن اچانک پھر ان کا عشق جاگ اٹھتا ہے اور امید کی ایک نئی کرن روشن ہو جاتی ہے۔ جوش، ولولہ اور ہیجان کے ساتھ شاعر دوبارہ مسکرانے لگتا ہے اس کا اندازہ نظم ''تجدید'' سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

تلاطم، ولولے، ہیجان، ارماں
وہی چنگاریاں پھر مسکرادیں

کیفؔی کے برعکس جاں نثار اختر کے یہاں اگر ایک بار محبوبہ دل توڑ دے تو پھر دوباہر عشق و محبت کرنے کی خاطر ان کے پاس دل ہی نہیں رہ جاتا کہ دوبارہ وہ محبوبہ سے اس قسم کی تمنا کریں۔ لہٰذا نہایت مایوس کن لہجے میں اختر کہتے ہیں:

اب تو نے چاہا اب تو نے مانگا
اب دل کہاں سے ہوگا فراہم

کیفؔی کی دوسری نظم ''حوصلہ'' سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں جلدی مایوس نہیں ہوتے لیکن اس کے برعکس جاں نثار اخترؔ کے مجموعۂ کلام خاکِ دل کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی نظمیں ایسی مل جائیں گی جیسے پچھلی پریت، بھولا افسانہ، ان کی ہم شکل، بیزاری وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اخترؔ کے یہاں برداشت کا مادہ بالکل نہیں۔ کیفؔی کے برعکس وہ بہت جلد محبوبہ کی بے وفائی لاپرواہی سے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں ان کی مایوسی کا یہ عالم ہے کہ دوبارہ محبوبہ کے چاہنے پر بھی اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ اخترؔ کے برعکس کیفؔی کہتے ہیں:

ابھی عشق نے ہار مانی نہیں
ابھی عشق کو آزمانہ نہ چھوڑ

کیفؔی کی رومانی شاعری کی ایک یہ بھی بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ محبوبہ کی بے وفائی پر خاموش رہتے ہیں۔ کیفؔی نہ تو محبوبہ کو کوستے ہوئے نظر آتے

ہیں نہ تو اس کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں جیسا کہ فیض احمد فیض کے یہاں ہے کہ وہ ہر حال میں محبوبہ کی سلامتی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ نظم ''تبسم'' میں کیفی کی محبوبہ خود مسکراتی ہے اور عاشق کو جلاتی ہے۔ عاشق خاموشی سے برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیفی فرماتے ہیں:

پنکھڑی میں نہاں تھی چنگاری
ہاتھ جس نے مرا جلا ہی دیا

اور کلی مجھ پہ مسکراتی ہے

فیض کہتے ہیں:

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے

نظم ''نرسوں کی محافظ'' کا موضوع بزرگ اور نوجوان نسل ہے۔ اس نظم کے ذریعہ کیفی ان بزرگوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو نوجوان نسل کے لڑکے لڑکیوں پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ کیفی کا یہ تصور بالکل بجا ہے کہ وہ بزرگ جو خود گناہوں کا ایک انبار لیے بیٹھے رہتے ہیں وہی سب سے زیادہ نوجوان نسل پر پابندی عائد کرتے۔ کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی جوانی کھو چکے ہوتے ہیں وہ اٹھنے والی نوجوان نسل سے حسد کرتے ہیں اس میں ان عورتوں کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے جو اپنا وقت بھول کر نوجوانوں کی آزادی سے حسد کرتی ہیں۔ کیفی کا یہ بھی کہنا درست ہے کہ جہاں پر جس قدر

زیادہ پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہاں اتنی ہی زیادہ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ چنانچہ نوجوان نسل کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے اس سے دو فائدے ہوں گے ایک تو یہ کہ غلطیاں کم ہوں گی دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ ضرورت سے زیادہ پابندی عائد ہونے پر نوجوان نسل کی قابلیت اور صلاحیت دب کر رہ جائے۔ چنانچہ کیفؔی نے صاف لفظوں میں کہا ہے:

تری طرح کہیں یہ بھی نہ بجھ کے رہ جائیں
تپش نچوڑ نہ ان ناچتے شراروں کی

اس قسم کے تصورات کچھ حد تک ساحؔر لدھیانوی کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ کیفؔی صاف صاف لفظوں میں بزرگوں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں اپنے اس رویے کو بدلنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ ساحؔر صرف معاشرے کی پابندی کا ذکر کرتے ہیں۔ کیفؔی کی طرح یہ نہیں کہتے کہ یہ پابندی عائد ہونی چاہیے یا نہیں اور اس کے اثرات نوجوان نسل پر کیا پڑیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ساحؔر اتنا کہہ کر خاموش ہیں کہ:

سوچتا ہوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

نظم ''تم'' کفارہ ادا کرنے کے خیال سے تخلیق ہوئی بقول کیفؔی:

....شوکت کیفی نے شادی سے قبل پہلی ملاقات میں جو آٹو گراف لیا اس پر کچھ ایسا شعر لکھ دیا تھا جس سے اس کے دل کو چوٹ پہنچی اور انہوں نے شکایت کی شادی بعد

یہ نظم لکھ کر اس کا کفارہ ادا کر دیا''۔ (گفتگو کا ریکارڈ)

پوری نظم شوکت کیفی کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ بہت ہی خوبصورت اور دل کو چھو جانے والے الفاظ میں یہ نظم کہی گئی ہے ایک شعر ملاحظہ ہو:

شگفتگی کا لطافت کا شاہکار ہو تم

فقط بہار نہیں حاصل بہار ہو تم

کیفی کا یہ خیال بھی درست ہے کہ عشق و محبت کے درمیان اسی قدر پابندیاں عائد ہوتی ہیں کہ اگر محبوبہ وفاداری نبھانا بھی چاہے تو زمانہ اسے نبھانے نہیں دے گا۔ اپنے اس خیال کو شاعر نے نظم ''تصور'' میں بہت ہی حقیقی انداز میں پیش کیا ہے اس نظم میں یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ حقیقت پر مبنی ہے۔ شاعر کا یہ خیال بھی بالکل بجا ہے کہ:

نہیں محبت کی کوئی قیمت جو کوئی قیمت ادا کرو گی

وفا کی فرصت نہ دے گی دنیا ہزار عزم وفا کرو گی

نظم ''دوراتیں'' کیفی کی خاص نظموں میں سے نہیں ہے کیونکہ یہ خیال ہر شاعر کے یہاں عام ہوتا ہے کہ محبوبہ کے ساتھ جس قدر وقت گزارا جائے مختصر ہوتا ہے۔

کیفی کی نظم ''ملاقات'' کا موضوع خالص رومانی ہے اور روایتی بھی۔ فیض کی نظم ملاقات، کیفی کی نظم ''ملاقات'' سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ کیفی کے یہاں خالص عشقیہ تصورات ہیں جب کہ فیض کی نظم میں سیاسی اور عشقیہ دونوں تصورات موجود ہیں۔ خالص عشقیہ مضامین کے لحاظ سے کیفی کی نظم اعلیٰ درجے کی

ہے۔

نظم ''پشیمانی'' کا موضوع بھی خالص رومانی ہے۔ یہ نظم اس لحاظ سے خصوصیت کی حامل ہے کہ شاعر نے عشق و محبت کے درمیان پیدا ہونے والے جذبات کی عکاسی بہت ہی خوبصورت انداز میں کی ہے اور اس میں کسی قسم کی ماورائیت نہیں۔ بظاہر شاعر روٹھ کر محبوبہ کے پاس سے اٹھتا ہے لیکن دل میں یہ خواہش بھی ہے کہ محبوبہ روک لے تو رک جائے۔ نہ روکنے پر پشیمان بھی ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو

--

مگر اس نے روکا نہ مجھ کو منایا
نہ آواز ہی دی نہ واپس بلایا

--

میں آہستہ آہستہ بڑھتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جدا ہو گیا میں

کیفی کی یہ ایک خاص بات ہے کہ وہ اپنی کسی قسم کی کمزوری پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ معصومیت کے ساتھ اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر بھی محبوبہ کی بے وفائی پر پشیماں ضرور ہوتے ہیں یہ کہہ کر تسلی کر لیتے ہیں کہ میں نے خود محبوبہ کو نہیں چاہا۔ ساحر کا یہ خیال ہے کہ اگر ایک نے بے وفائی برتی ہے تو

دوسری تمام محبوبائیں مل جائیں گی۔

عشق ومحبت سے متعلق ن۔م راشدؔ کے کچھ اور ہی خیالات ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک الجھن میں مبتلا رہے وہ یہ کہ کبھی تو جنون کی حالت میں گناہ کر بیٹھتے اور پھر توبہ کرتے اور شرمندہ ہوتے اور کبھی محبوبہ سے دل لگانے کا عزم اس خیال سے کرتے کہ اب سے پاکیزہ زندگی گزاریں گے۔

پھر ایک پاکیزہ زندگی کے لیے بہت بیقرار ہوں میں

راشدؔ کبھی گناہ کرکے افسوس ظاہر کرتے ہیں تو کبھی گناہ نہ کرنے پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ فضول میں اپنے آپ کو تڑپاتا رہا۔ اکثر اپنی محبوبہ کو بھی جو جی میں آئے کرڈالنے پر آمادہ کرتے ہیں اور اخترؔ شیرانی اپنی محبوبہ کی بے وفائی پر اسے جی بھر کر پیار کرلینے کے لیے تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر اخترؔ شیرانی کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

خدائی بھر میں کسی شے کی جستجو نہ تھی
سوائے اس کے کچھ اخترؔ کی آرزو نہ تھی
ستم شعار کو جی بھر کے پیار کرلیتے

مجازؔ کے یہاں کہیں تو محبوبہ عاشق کا نام و پتہ جانے بغیر پیغام بھیجتی ہے کہ وہ آجائیں اور اکثر بے وفا نکلتی ہے اور مجازؔ سخت لہجے میں شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور محبوبہ کو پتھر سے مثال دیتے ہیں:

سنگ کو گوہر نایاب و گراں جانا تھا
دشت پرخار کو فردوس جواں جانا تھا

نظم ''مجبوری'' کا موضوع عشق و محبت ہے اس نظم کی خصوصیت صرف اتنی ہے کہ عاشق کو نہ چاہتے ہوئے بھی محبوبہ کی اداؤں پر ہنسنا پڑتا ہے۔ کوئی نیا یا خاص مقصد نہیں۔

ایک عاشق اپنی معشوقہ کی تصویر اپنی فنی صلاحیت کی بنا پر کسی طرح کھینچتا ہے اس کی بھرپور عکاسی کیفی کی نظم ''نقش و نگار'' میں ملتی ہے۔ قدرتی طور پر فن کار بے چین نظر آتا ہے محبوبہ کی تصویر کھینچنے کے لیے۔ لٰہذا شاعر معشوقہ کو روکتے ہوئے کہتا ہے کہ:

جاگ اٹھی ہے فطرتِ فنکار
اب کدھر جا رہی ہے جانِ بہار
تیری تصویر کھینچنا ہے مجھے

اگر کچھ عرصہ تک محبوبہ کی خبر نہ ملے اس کا کوئی پیغام نہ آئے تو عام طور پر شعرا یہی تصور کرتے ہیں کہ معشوقہ بھول گئی ہوگی۔ لیکن کیفی کے یہاں ایسا نہیں ہے جیسا کہ ان کی اکثر نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوتے۔ اسی طرح نظم ''اندیشے'' میں بھی ہے کہ بہت عرصے تک معشوق کی کوئی خبر نہ ملنے پر بھی عاشق کو کامل یقین ہے کہ محبوبہ بے وفا نہیں ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنے عاشق کو نہیں بھولی ہوگی بلکہ زمانے نے اسے مجبور کر دیا ہوگا بھلانے کے لیے۔ اگر اس نے بھلایا ہے تو مجبوری کے تحت اور رو رو کر بھلایا ہوگا:

وہ مجھے بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے
رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا

کیفی کی اس نظم کا تعلق ان کی ذاتی زندگی سے اور بالکل حقیقی معلوم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو:

بند کمرے میں مرے خط جو جلائے ہوں گے
ایک ایک حرف جبیں پر ابھر آیا ہوگا

اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے صرف عاشق کے جذبات کی ترجمانی نہیں کی ہے بلکہ معشوق کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ یہ رنگ ان کی اسی نظم میں نہیں ہے بلکہ کیفی کی اکثر نظمیں عاشق کے ساتھ ساتھ معشوق کے جذبات کی بھی ترجمان نظر آتی ہیں جو کیفی کو اپنے تمام ہمعصر شعرا سے مختلف اور ممتاز کرتی ہیں۔

محبوبہ عاشق کو پریشان حال دیکھ کر پریشان ہو اور اس کے آرام و تکلیف کا خیال رکھے اور عاشق کو نصیحت کرے کہ وہ اپنی جوانی کو مٹی میں نہ ملائے، برباد نہ کرے۔ اس قسم کے تصورات صرف کیفی کے یہاں نظر آتے ہیں اور یہ بالکل جدید تصورات ہیں ماورائی یا روایتی نہیں۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

دیکھ کر اب کہیں گھنا سایہ
آپ بھی بیٹھ جایئے کیفی

پھر آخر میں عاشق و معشوق کی اس نصیحت کو یاد رکھنے کا وعدہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

یاد عہد وفا بھی ہے تیرا
یاد رکھوں گا یہ نصیحت بھی

کیفی نے بار بار کئی نظموں میں اس بات کی تردید کی ہے کہ محبوبہ بے وفا نہیں ہوتی ہے۔ یہی بات نظم ''احتیاط'' میں بھی کہی ہے کہ محبوبہ بے وفا نہیں ہوتی بلکہ معاشرہ اسے بے وفا بنا دیتا ہے۔ زمانے کو اس قدر ظالم ٹھہرایا ہے کہ محبوبہ اگر تصور میں بھی آنا چاہے تو زمانہ اسے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بہت ہی صاف لفظوں میں کیفی نے کہا:

اب تم آغوشِ تصور میں بھی آیا نہ کرو
تم کو یہ رسم بھی دنیا نہ نبھانے دے گی

اس نظم میں بھی کہیں پر کسی قسم کی ماورائیت نظر نہیں آئے گی۔ بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔

کیفی کی طرح ساحرؔ کے یہاں بھی محبوبہ پر معاشرے کی زمانے کی پابندیاں عائد ہیں۔ اس خوف کی بنا پر محبوبہ اپنے عاشق کے ساتھ وفاداری کا سلوک کرنے سے قاصر نظر آتی ہے لیکن دونوں شاعروں کے یہاں ایک چیز بالکل مختلف ہے۔ وہ یہ کہ کیفی کے برعکس ساحرؔ اپنی محبوبہ کو خیالوں میں جگہ دے کر خوش رہتے ہیں۔ شائد ساحرؔ کو کیفی کی طرح اس بات کا احساس ہی نہ ہوا ہو کہ خیالوں کی دنیا میں معشوق کو جگہ دینے پر بھی زمانے کو اعتراض ہوگا۔ اس قسم کے احساسات میں کیفی سب سے آگے نکل آئے ہیں۔ اس قسم کے احساسات کیفی کو اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز اور مختلف کرتے ہیں۔

کیفی اعظمی کے تیسرے مجموعۂ کلام ''آوارہ سجدے'' میں درج ذیل رومانی نظمیں شامل ہیں۔ ''نیا حسن''، ''ایک بوسہ''، نذرانہ''، ''پیار کا جشن''،

''اجنبی''۔

نظم ''نیا حسن'' کا موضوع رومانی اور سیاسی دونوں ہے۔ رومانی اس بنا پر کہ عرصہ سے عاشق کو محبوبہ کا انتظار رہتا ہے۔ ایک دن اچانک اجنتا کی دیواروں کی مجسمہ کی صورت میں محبوبہ کا دیدار ہو جاتا ہے اور ایک طرف تو عاشق خوش نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف افسوس ظاہر کرتا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ زمانے کی تباہی و بربادی نے اس قدر بے بس، مجبور، غریب، ناتواں بنا رکھا ہے کہ عاشق کے پاس پیار کے علاوہ کچھ نہیں جو محبوبہ کو تحفہ کے طور پر دے سکے۔ یہ نظم زمانے کی حقیقت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

کیفی نے نظم ''بوسہ'' میں عاشق اور معشوق کے وصال کو نہایت ہی خوبصورت پر اپنے انداز میں بیان کیا۔ وصال یار کو اس قدر اہمیت دی ہے اور یہ منظر ان کی نظر میں اتنا دلکش ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ ظلم کو چھوڑ کر وصالِ معشوق کے منظر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ انسان تو انسان پتھر تک مسکرانے لگتے ہیں۔ کس انداز میں شاعر نے منظر کشی کی ہے اس کی مثال میں ایک شعر ملاحظہ ہو:

لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

کیفی کی قریب قریب تمام رومانی نظموں کی خصوصیت ہے کہ عاشق معشوق کی بے توجہی پر شکایت نہیں کرتا۔ کیفی کی ایسی تمام نظموں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یوں تو کیفی معشوقہ کی بے وفائی کا گلہ نہیں کرتے اور

اگر کرتے بھی ہیں تو اس کی وجہ تلاش لیتے ہیں کہ آخر وجہ کیا ہے کہ معشوق توجہ نہیں دے رہا ہے۔ وجہ تلاش کرنے کے بعد معشوق کی بے وفائی کو جائز قرار دے کر خود کو تسلی کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم ''نذرانہ'' میں معشوق کو کچھ دیر پکار کر تسلی کر لیتے ہیں لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ اور یہاں پر معشوق کی بے توجہی کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کے علاوہ معشوق کو بہت سے عاشق مل گئے ہیں اس لیے اب ان کی ضرورت نہیں۔ اس کی بہترین مثال ''نذرانہ'' کا یہ شعر ہے:

کیا کمی ہے جو کروگی مرا نذرانہ قبول
چاہنے والے بہت چاہ کے افسانے بہت

نظم ''پیار کا جشن'' یوں تو رومانی ہے لیکن کیفی کا اشتراکی نظریہ بھی پوشیدہ ہے کیونکہ پیار و محبت اور محبوبہ کی آمد کا جشن اور خوشی میں تنہا شامل ہونا پسند نہیں کرتے۔ اپنی خوشی کے ساتھ وہ تمام قوم اور پوری کائنات کو شامل کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

پیار کا جشن نئی طرح منانا ہوگا
غم کسی دل میں سہی غم کو مٹانا ہوگا

نظم ''اجنبی'' بھی بظاہر رومانی نظم ہے لیکن اس کا خاص موضوع معاشرے کے کچھ ایسے غدار ہیں جو اپنی پیاس بجھانے کی خاطر معصوم عورتوں کی عزت سے کھیلتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر شاعر نے کاری ضرب لگائی ہے اور سخت لہجے میں طنز کیا ہے۔ کیفی کو سخت افسوس ہے کہ عورت اس دنیا میں پیدا ہی کیوں کر ہوئی اور اگر پیدا بھی ہوگئی تو اس پر خارِ جہاں میں بہت سنبھل کر اسے قدم رکھنا چاہیے:

خار ہی خار شرارے ہی شرارے ہیں یہاں
اور تھم تھم کے اٹھا پاؤں بہاروں کی بہار

--

تشنگی زہر بھی پی جاتی ہے امرت کی طرح
جانے کس جام پہ رک جائے نگاہ معصوم
ڈوبتے دیکھا ہے جن آنکھوں میں میخانہ بھی
پیاس ان آنکھوں کی بجھے یا نہ بجھے کیا معلوم

کیفی اعظمی کی تمام رومانی نظموں کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی رومانی شاعری کی بنیاد روایتی عشقیہ نظریات وتصورات وامکانات پر ہے۔ محبوب کا تصور اردو کی قدیم رومانی شاعری کی طرح روایتی اور اکتسابی نہیں ہے۔ قدیم اردو شاعری میں عورت کو ماورائی حسن کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ قاتل، بے رحم، سفاک، ہرجائی، بے وفا، وعدہ خلاف، دروغ گو، بے حجاب، شراب پینے اور پلانے والی، غرض یہ کہ دنیا کی تمام برائیوں کی حامل ایک ایسی عورت ظاہر کیا گیا ہے جو دنیا کی مخلوق نہیں معلوم ہوتی۔ برخلاف اس کے کیفی نے اپنی شاعری میں جس محبوب کا تصور پیش کیا ہے وہ گوشت پوست رکھنے والا دنیا کا انسان ہے۔ جو دوسروں کے غم سے دکھی بھی ہوتا ہے، عاشق کی خوشنودی اور ہمدردی بھی کرتا ہے، اگر عاشق کے حسبِ منشا عمل نہیں کرسکتا تو وہ وعدہ خلافی کی بنا پر نہیں بلکہ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے۔

کیفی کی امن پسند طبیعت اور مزاج کی نرمی محبوب سے بے وفائی کرنے

سے باز رکھتی ہے۔ محبوب کے پیمان وفا توڑنے پر بھی وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتے بلکہ اس کی بے وفائی کے لیے بھی جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ صلح جو طبیعت محبوب کو موردِ الزام ٹھہرانا پسند نہیں کرتی۔ کیفی کی رومانی نظمیں ایک ناکام یا نامراد عاشق کا المیہ نہیں ہیں۔ نئے اور موجودہ دور کے نوجوان عاشق اور محبوب کی بڑی سچی ترجمانی ملتی ہے۔ انہیں لطیف جذبات و نازک احساسات کی ترجمانی اس سادگی اور لطافت کے ساتھ ملتی ہے کہ شاعر کی مہارت اور چابکدستی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ نرم و سبک الفاظ، خوبصورت تشبیہات و استعارات اور خوش گوار صوتی آہنگ رکھنے والی تراکیب استعمال کرنے کا جیسا سلیقہ کیفؔی اعظمی کو آتا ہے ان کے تمام معاصرین میں فیضؔ اور مخدومؔ کے علاوہ بہت کم کے حصے میں آیا ہے۔

عام طور پر رومانی شاعروں کے یہاں عاشق کی قلبی کیفیات کے مرقع تو نظر آتے ہیں لیکن محبوب کی وارداتِ قلب اور نفسیاتی پہلو کو بہت کم شعرا نے موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں کیفؔی اعظمی کی بہت سی نظمیں انہیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''اندیشے'' میں حالات کے جبر نے محبوبہ کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے عاشق کو بھول جائے۔ لیکن اس بھلانے کے عمل میں محبوبہ کے دل پر کیا کچھ گزرتی ہے اس کی نہایت خوبصورت عکاسی کیفی اعظمی کی اس تخلیق میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ نظم ''تصور'' میں بھی محبوبہ کے دلی جذبات کی سچی ترجمانی پائی جاتی ہے۔ ''نرسوں کی محافظ'' میں ایک بوڑھی زخم خوردہ نرس انتقاماً نوجوان نرسوں سے سخت گیری کا جو برتاؤ روا رکھتی ہے اس کا نفسیاتی تجزیہ پیش

کیا گیا ہے۔ نظم ''احتیاط'' بھی اسی سلسلے کی تخلیق ہے جس میں سماج سے خوفزدہ محبوبہ کی معذوریوں کے پیش نظر اس کی بے التفاتی کو معاف کر دیا ہے۔ منظر خلوت میں ایک مجبور بیکس حسین بیوہ کے دلی احساسات اور جذبات کو شعری زبان مل گئی ہے۔ ''نیا حسن'' میں عصرِ حاضر کی شوخ وشنگ اور فیشن ایبل محبوبہ کا سراپا کھینچا گیا ہے اور نئے زمانے کے مطابق حسن کے بدلتے ہوئے انداز کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اس طرح مثال کے طور پر نظمیں ایسی مل جائیں گی جن میں عاشق و معشوق دونوں کے جذبات واحساسات کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔

کیفی اعظمی نے محبوبہ کی سراپا نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ویسے تو ان کی تمام رومانی نظموں میں محبوب کے نقش و نگار ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن نظم ''اللہ رے شباب کا زمانہ'' اور ''دوشیزہ مالن'' میں محبوب کے حسن کی بڑی حسین مرقع کشی کی ہے۔ یوں تو عام طور پر عاشق کو اپنا محبوب دنیا کا سب سے حسین فرد نظر آتا ہے اور جب جب وہ اس کے نقش و نگار کی بات کرتا ہے تو اس کی مدح سرائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چنانچہ کیفی نے بھی محبوب کی مدح سرائی کو غلو کی حدوں میں داخل کر دیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ محبوب کے حسن و جمال کا یہ ایک کامیاب قصیدہ ہے تو غلط نہ ہوگا۔

کیفی اعظمی کی رومانی نظمیں فکر کے اعتبار سے بھی جدید ہیں۔ ان کی فکر کی پرواز میں بلا کی بلندی ہے اور اس کے ڈانڈے حقیقت سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری میں تصور کی جلوہ گری اور حقیقت نگاری کا ایسا حسین امتزاج ہے جیسے سچے موتیوں میں آب۔ ان کی شاعری میں قوسِ قزح کے حسین اور

دلفریب رنگ بکھرے ہوئے ہیں جس کا ہر رنگ دامن دل کو کھینچتا ہے۔ اس کے ساتھ دل و دماغ میں روشن قندیلیں منور کر دیتا ہے۔ حسن و رنگ کا حسین امتزاج کیفی اعظمی کی شاعری کو ابدیت بخشتا ہے۔ اس کے علاوہ تسلسل، ربط، نزاکت احساس اور پوشیدہ جذبوں کی کیفیات بھی پائی جاتی ہیں۔ کیفی کی شاعری میں فکر کی گہرائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان کو بلا مبالغہ نفسیاتِ انسانی کا شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کا تار و پود اور نظم کے تانے بانے سب اس سے بنے جاتے ہیں اور تمام نظمیں انھی جذبات کی بہترین ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

کیفی اعظمی کی فکر اس لحاظ سے بھی جدیدیت کے عین مطابق ہے کہ ان کے یہاں زندگی سے گریز اور فرار نہیں ہے وہ زندگی کی مشعل کو حوادث کے طوفانی تھپیڑوں میں بھی جلائے رکھنے کا عزم جواں رکھتے ہیں۔ مایوسی و بیزاری سے ان کی ہمت پست نہیں ہوتی۔ لیکن تقاضائے بشری سے وہ بھی کبھی کبھی قدرت کے بھیانک مذاق سے کانپ جاتے ہیں اور کراہ اٹھتے ہیں لہٰذا وقتی طور پر انہیں بھی اکثر بیزاری کا احساس ہوتا ہے۔

کیفی کی رومانی شاعری زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔ ان کے کردار اس دنیا کے کردار ہیں اور جو بھی حادثات و واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ بھی مافوق الفطرت نہ ہوکر اس دنیا میں پیش آنے والے حقیقی ہیں۔ کیفی جن مناظر کی تصویر کھینچتے ہیں ان سے ہماری آنکھیں بڑی حد تک مانوس ہیں۔ لہٰذا کیفی کے اشعار میں ہم ان احساسات کو پاتے ہیں جنہیں محسوس تو کرتے ہیں لیکن اظہار نہیں کر سکتے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کیفی کی شاعری نہ صرف یہ کہ ان

کے اپنے ہی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے بلکہ عوام کے احساسات کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔

کیفی نے اپنی تمام رومانی نظموں میں آسان سے آسان زبان کا استعمال کیا ہے۔ نہایت ہی سیدھے سادھے الفاظ میں اپنے جذبات وتصورات کا اظہار کرتے ہیں اور انداز بیان دلکش لہجے میں نرمی اور شگفتگی ہے البتہ کہیں کہیں محبوبہ سے مخاطب ہونے میں شوخی کا ہلکا سا اظہار نظر آتا ہے۔

جنوں کو اتنا نہ گدگداؤ پکڑ لوں دامن تو کیا کرو گی

قریب بڑھتی ہی آرہی ہو

یہ خواب کیسا دکھا رہی ہو

کیفی نے ہر جگہ پیچیدہ الفاظ اور رمزیت سے پرہیز کیا ہے۔ تشبیہ و استعارے کا کوئی خاص استعمال نہیں۔ اگر کہیں استعمال بھی کرتے ہیں تو بہت ہی آسان اور عام فہم زبان میں۔ قاری کو سمجھنے میں ذرا بھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے باوجود شعریت ہر جگہ برقرار ہے۔ شعر کا ہر لفظ دل کو چھونے والا ہوتا ہے شعری آہنگ ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ محبوبہ سے منت سماجت کرنے کا ڈھنگ بھی دلکش اور انوکھا ہے۔ جہاں کہیں معاشرے کی پابندی اور خوف سے محبوبہ اپنے اظہار محبت میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہے وہاں کیفی کے لہجے میں سختی آجاتی ہے۔

آنکھ ایسوں کی بچاتی کیوں ہو؟

تم محبت کو چھپاتی کیوں ہو؟

ظلم تم نے کوئی ڈھایا تو نہیں
ابن آدم کو ستایا تو نہیں
خوں غریبوں کا بہایا تو نہیں

میں اور میری شاعری

میں

کب پیدا ہوا.................. یاد نہیں

کب مروں گا................ معلوم نہیں

اپنے بارے میں یقین کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں محکوم ہندوستان میں پیدا ہوا۔ آزاد ہندوستان میں بوڑھا ہوا اور سوشلسٹ ہندوستان میں مروں گا یہ کسی مجذوب کی بڑیا دیوانے کا خواب نہیں ہے۔ سوشلزم کے کے لئے ساری دنیا میں اور خود میرے اپنے ملک میں ایک مدّت سے جو عظیم جدوجہد ہو رہی تھی اس سے ہمیشہ میرا اور میری شاعری کا تعلّق رہا ہے اس یقین نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

میں اُتر پردیش کے ایک مردم خیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں پیدا ہوا گھر پر کاشتکاری بھی ہوتی تھی چھوٹی موٹی زمینداری بھی تھی۔ میرے والد سید فتح حسین رضوی مرحوم کو قدرت نے ایک ایسی نگاہ عطا کی

تھی جو پتھر کے سینے میں تیانِ آرزی کا رقص دیکھ لیا کرتی تھی آج سے ۸۰،۹۰ برس اُدھر جب میرے سب سے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو ابا میاں نے اماں سے کہا ہندوستان میں زمینداری کا کوئی مستقبل نہیں ہے، اگر ہم اس پر تکیہ کئے بیٹھے رہے تو نہ بچوں کی تعلیم ہو سکے گی نہ تربیت اس لئے میں گاؤں سے نکل کر باہر جاتا ہوں اگر کوئی ڈھنگ کی ملازمت مل گئی تو آپ کو بھی وہیں بلالوں گا اور جہاں تک ممکن ہوگا بچوں کو لکھنؤ میں رکھوں گا تا کہ وہاں ان کی مناسب تعلیم ہو سکے اور زبان بھی نکھر جائے۔ ابا کے اس فیصلے سے خاندان میں کہرام مچ گیا کہ کتنا غلط اقدام ہے اگر اپنا راج پاٹ چھوڑ کے انہوں نے نوکری کر لی تو پورے زمینداروں کی ناک کٹ جائے گی۔ ابا نوکری کا فیصلہ اس لئے کر سکے کہ اس وقت سارے خاندان مین تنہا وہی تعلیم یافتہ تھے، خاندان کی چیخ و پکار پر کان دیے بغیر ابا لکھنؤ چلے گئے خوش قسمتی سے ان کو بہت جلدی اودھ کی ایک مشہور ریاست بلہرہ میں تحصیل داری مل گئی اس کے بعد ابا نے بیوی بچوں کو بھی وہیں بلالیا اور لکھنؤ میں ایک مکان کرایے پر لے کر لڑکوں کو وہاں رکھا، کچھ دنوں کے بعد بڑے بھائی پڑھنے کے لئے علی گڑھ بھیج دیے گئے ان کے بعد کے دو بھائی لکھنؤ میں رہے ان کی تعلیم وہیں ہوئی، ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک لیکن ابا نے گاؤں سے رشتہ توڑا نہیں اپنے چھوٹے بھائیوں کو روپے بھیجتے رہے۔ کاشتکاری جو پہلے سے ہوتی تھی اس نے اس زمانے میں بہت ترقی کی ابا نے گاؤں میں گھر بنوایا جس کو گاؤں کے عام گھروں کے مقابلے میں حویلی کہہ سکتے ہیں۔
زمیندار ہونے کے باوجود ابا کو اپنی بیٹیوں سے زیادہ پیار تھا لیکن بدقسمتی سے

سب سے بڑی باجی کو دِق ہو گئی، اس وقت دق نزلے زکام سے زیادہ نہیں، لیکن اُس وقت یہ بیماری کینسر سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ابا نے باجی کا اچھے سے اچھا علاج کرایا اماں ان کو لے لے کر اس ڈاکٹر کے پاس سے اُس ڈاکٹر کے پاس اس اسپتال سے اُس اسپتال اس شہر سے اُس شہر جاتی رہی لیکن الٹی ہو گئیں کل تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا تین چار سال بیمار رہ کے باجی کا انتقال ہو گیا ان کے بعد تین اور بہنیں یک بعد دیگرے اسی موذی مرض کا شکار ہوئیں ان کا بھی اسی طرح علاج ہوا میں اس وقت گھر میں سب سے چھوٹا تھا اماں جہاں اپنی کسی بیٹی کو لے کر علاج کے لئے جاتیں مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا اس طرح میں نے اس کچی عمر میں اپنے چاروں طرف بیماریوں اور دکھوں کا ہجوم دیکھا اور میں دھیرے دھیرے غم پسند ہوتا جاتا بدقسمتی سے ان بہنوں کا بھی انتقال ہو گیا چار چار جوان بیٹیوں کی موت سے ابا ہر اعتبار سے بہت کمزور ہو گئے وہ یہ سوچنے اور کہنے لگے کہ ہم نے اپنے سب لڑکوں کو انگریزی پڑھائی ہے، اس لئے گھر پر یہ ادبار نازل ہوا ہے وہ اماں سے اکثر کہتے کہ جب ہم مریں گے تو کوئی بیٹا فاتحہ بھی نہ پڑھے گا انگریزی اسکولوں میں ان کو فاتحہ پڑھنا سکھایا ہی نہیں گیا ہے اس لئے والدین نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا کہ مجھے مذہبی تعلیم دلائی جائے اس بات کو نئی نسل کی ایک ترقی پسند افسانہ نگار عائشہ صدیقی نے میرے بارے میں اپنے ایک مضمون میں اس طرح لکھا ہے:

”کیفی صاحب کو ان کے بزرگوں نے ایک دینی درس گاہ میں اس غرض سے داخل کیا تھا وہاں یہ فاتحہ

پڑھنا سیکھ جائیں گے۔ کیفی صاحب اس درس گاہ میں
مذہب پر فاتحہ پڑھ کر نکل آئے''۔

اس درس گاہ کی بات یہ ہے کہ والدین نے مجھے مولوی بنانے کے خیال سے میرے لئے انگریزی کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا۔ چچا مرحوم جو کاشتکاری سنبھالتے تھے وہ مجھے کچھ بھی پڑھانے کے خلاف تھے وہ ابا سے ہمیشہ کہتے کہ آپ نے جن لڑکوں کو صاحب بہادر بنادیا ہے وہ تو نہ کبھی گاؤں میں رہیں گے نہ کھیت کھلیان کے چکر میں پڑیں گے، میں اب کتنے دن جیوں گا اور کتنے دن اتنی بڑی کھیتی کو سنبھالوں گا ایک لڑکے کو تو اس قابل رہنے دیجئے کہ وہ ان چیزوں کو سنبھال سکے۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ بھائی صاحبان جب چھٹیاں گزار کے لکھنؤ جانے لگتے تو میں گھر کے کسی کونے میں رو رو کے اپنا برا حال کر لیتا ان حالات میں عمر کا وہ حصہ جس میں تعلیم شروع ہو جانا چاہئے تھی ضائع ہو گیا، لیکن اچانک قسمت نے یاوری کی۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی اس کا طریقہ یہ ہے کہ منھ اندھیرے کسان اپنے ہنسیا لے کر آجاتے ہیں اور دوپہر تک بڑے سے بڑا کھیت صاف ہو جاتا ہے اس کا معاوضہ ان کو یہ ملتا ہے کہ وہ جو چیز کاٹتے ہیں اس کی چھوٹی چھوٹی پولیاں بنا کے کھیت میں ایک قطار سے بچھا دیتے ہیں۔ بیس پولیاں زمیندار کی ہوتی ہیں اکیسویں کسان کی جو فصل کاٹتا ہے۔ ہمارا سب سے بڑا کھیت جس میں گلے گلے جُو آیا تھا وہ کٹ رہا تھا، اتفاق سے چچا کو تحصیل جانا تھا وہ جاتے جاتے مجھے کھیت میں بٹھا گئے اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ دھیان رکھنا یہ لوگ بڑے بے ایمان ہوتے ہیں اور حرام خور بھی یہ اکیسویں پولی ہمیشہ بہت

بڑی بناتے ہیں ایک ایک پولی میں دو دو تین تین پسیری اناج وہ لے کے چلے جاتے ہیں کسی کو ایسا نہ کرنے دینا خبردار، میں نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ میں ایک بال کسی کو زیادہ نہ لے جانے دوں گا۔ مطمئن ہو کے چچا تحصیل چلے گئے فصل کٹتی رہی میں نگرانی کرتا رہا گاؤں کی ایک خوبصورت اور جوان لڑکی بھی فصل کاٹ رہی تھی میں زیادہ تر اسی کے قریب کھڑا رہا دوپہر تک اس کے گورے گورے گالوں سے دھوپ رنگ بن کے ٹپکنے لگی اس کو کچھ اپنے اوپر اعتماد تھا کچھ میری کمزوری بھی وہ سمجھ چکی تھی اس لئے اس نے اپنی پولیاں بہت بڑی بنا رکھی تھی اور جب میں ان کو دیکھنے لگتا تو وہ مسکرانے لگتی۔ اس نے پولیاں جیسی بنائی تھیں ایسی ہی میں نے اس کو لے جانے دیں، گاؤں کی ایک بوڑھی عورت یہ سب کچھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی اس نے تھوڑا سا اناج چرا رکھا تھا اتنے میں چچا آ گئے انہوں نے اس بوڑھیا کو پکڑ لیا اس کو ڈرایا دھمکایا تو اُس نے اُن سے نمک مرچ لگا کے میری شکایت جڑ دی کہ

''تو نے ہم سے مٹھی بھر جو چھین لئے تیرے بٹوا نے اوکا
اُو جون پُتریا کی طرح سنگار کر کے کاٹے ای ری بوجھ کا
بوجھ اٹھائے کے او کے سر اپر رکھ دیں''

چچا نے میرا کان پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے گھر میں امّاں کے پاس لے گئے کہ ان کو بھی وہیں بھیج دیجئے یہ گاؤں میں رہیں گے تو سب کچھ لٹا دیں گے۔ مجھے مانگی مراد مل گئی، دو چار دن کے بعد امّاں نے ماموں کے ساتھ مجھے لکھنؤ بھیج دیا۔

لکھنؤ میں شیعوں کی سب سے بڑی درس گاہ سلطان المدارس میں میرا

نام لکھا دیا گیا اور بورڈنگ میں داخل کر دیا گیا، اس دینی درس گاہ میں پہونچ کے اور بورڈنگ میں رہ کے مجھ پر عرفی کے ایک شعر کی صداقت پوری طرح ظاہر ہوئی۔

مفتیاں کیں جلوہ بر محراب و ممبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

میں دیکھتا تھا کہ روز جب انٹرول ہوتا ہے مولانا جو ہمیں پڑھاتے تھے ہمارے درجے کے ایک لڑکے کو جس کے خط و خال دل کش تھے اپنے ساتھ لے کے اپنے کمرے میں چلے جاتے اور اندر سے دروازہ بند ہو جاتا۔ میں نیا نیا گاؤں سے آیا تھا گاؤں کے لوگوں میں تجسس زیادہ ہوتا ہے میرے دل میں بھی کرید پیدا ہوئی کہ دیکھوں کمرے میں ہوتا کیا ہے۔ روشندان جو ذرا بلندی پر تھا میں نے اس کے نیچے ایک پیر رکھا اس پر کھڑا ہو کے روشندان سے کمرے میں جھانکنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے مولوی صاحب پلنگ پر دراز ہیں دو تین مولوی صاحبان پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھے ہیں لڑکا ہمارے مولوی صاحب کے پلنگ پر بیٹھا ایک چھوٹی سی کتاب پڑھ کے اُن کو سنا رہا ہے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مولوی صاحب کہتے لاحول ولاقوۃ اور لڑکے کے گال میں زور سے چٹکی لیتے، باری باری مولوی صاحبان بھی یہی حرکت کرتے۔ اس وقت شیعہ مولوی صاحبان اور مولانا عبدالشکور میں بڑے مناظرے ہو رہے تھے میں سمجھا اس سلسلے کی یہ کوئی کتاب ہوگی ہمارے مولوی صاحب جس کا منہ توڑ جواب لکھیں گے شاید۔

جب کمرہ کھلا اور لڑکا باہر نکلا تو میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے طرح طرح سے پوچھنا شروع کیا کہ تم کیا پڑھ کے سناتے ہو وہ کچھ گھبرا سا گیا تو مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے بھاگ کے کمرے میں گیا اور کتاب لا کے مجھے دکھائی یہ مختصر افسانوں کا ایک مختصر سا مجموعہ انگارے تھا جس پر یوپی سرکار نے پابندی لگا رکھی تھی، ترقی پسند ادب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

سلطان المدارس جس دن قائم ہوا تھا اسی دن اسکے سارے قاعدے قانون بن گئے تھے اس میں حالات کے مطابق پھر کسی ترمیم و تنسیخ کو حرام سمجھا گیا تھا میں نے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کے طالب علموں کی ایک انجمن بنائی اور انجمن کی طرف سے طالب علموں کے کچھ مطالبے مرتب کر کے سلطان المدارس کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کیے اس کا جواب ہم کو یہ ملا کہ یہ انجمن ہماری مخالفت میں بنائی گئی ہے ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے انجمن کو فوراً توڑ دو ورنہ....

انجمن بن چکی تھی۔ اس کو توڑنے کا تو کوئی سوال تھا ہی نہیں ہم نے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو نوٹس دیا کہ اگر فوراً ہماری انجمن کو تسلیم نہ کیا گیا تو ہم اسٹرائک کر دیں گے اور ہوا یہی کہ ہم کو کچھ ہی دنوں کے بعد اسٹرائیک کرنا پڑی اسٹرائک میں تمام طالب علم شریک ہوئے اور کچھ دنوں کے بعد دفتر کا عملہ اور کچھ استاد بھی ہمارے ساتھ آ گئے اسٹرائیک کی اس وسعت سے ارباب اقتدار بوکھلا گئے انہوں نے نوٹس دیا کہ سلطان المدارس بند کیا جاتا ہے اور بورڈنگ بھی بند کیا جاتا ہے۔ تم لوگ کمرے چھوڑ دو اور اپنے اپنے گاؤں چلے

جاؤ جب سلطان المدارس کھلے گا تم لوگ بلا لئے جاؤ گے۔ ہم لوگوں نے اس
ٹوٹس کا کوئی نوٹس نہیں لیا کمروں میں بھی ڈٹے رہے اور اپنے مطالبات پر بھی
ڈٹے رہے ایک رات حسین آباد کے کارندے موٹے موٹے ڈنڈے لے کے
آئے انہوں نے ہمارا سامان کمروں سے نکال نکال کے باہر پھینک دیا اور ہماری
اچھی خاصی پٹائی بھی کی ہم بھی اہنساوادی نہیں تھے ہم نے بھی اینٹ کا جواب
پتھر سے دیا اور بورڈنگ پر قبضہ کئے بیٹھے رہے اس رات تک میری شاعری
شروع ہو چکی تھی شاعری کی ابتدا ایک روایتی غزل سے ہوئی تھی لیکن اس
اسٹرائیک کے دوران غزل کی مستانگی چھوٹ گئی اور میں احتجاجی شاعری کرنے
لگا قریب قریب روز ایک نظم کہہ لیتا لڑکوں کو سناتا اور ان میں جوش پیدا کرتا پٹائی
کے بعد دوسرے دن سلطان المدارس کے شمالی پھاٹک پر میٹنگ ہو رہی تھی لڑکے
کچھ زمین پر بیٹھے تھے کچھ کھڑے تھے میں ان کے درمیان کھڑا ایک نظم
سنا رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت وجیہ بزرگ تانگے پر بیٹھے ہماری
طرف آ رہے ہیں میں گھبرایا کہ یہ حضرت آ کے ابھی ہم کو سمجھانا شروع کریں گے
کہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو اس سے ہمارا اتنا بڑا تعلیمی ادارہ بدنام ہو رہا ہے وغیرہ
وغیرہ گھبراہٹ میں وہ نظم اور جوش سے پڑھنے لگا قریب آ کے وہ بزرگ تانگے
سے اتر پڑے اور میٹنگ میں شامل ہو گئے، نظم ختم ہوئی تو انہوں نے مجھ سے نظم
مانگی میں نے دے دی ایک سرسری نظر ڈال کے انہوں نے نظم جیب میں رکھ لی او
رمجھ سے کہا تم اور تم جن کو چاہو اپنے ساتھ لے لو اور میرے ساتھ میرے گھر چلو
میں نے گنواروں کی طرح پوچھ لیا کہ آپ ہیں کون بزرگ انہوں نے فرمایا مجھے

علی عباس حسینی کہتے ہیں، علی عباس حسینی اُردو والوں میں پریم چند کے بعد دوسرا بڑا نام، میں سر جھکائے ان کے پیچھے ہولیا دہ گولہ گنج میں رہتے تھے گھر پہونچ کے حسینی صاحب نے نوکر کو چائے بنانے کا حکم دیا اور اپنے صاحبزادے سے کہا جاؤ دیکھو احتشام صاحب یونیورسٹی سے آگئے ہیں، آگئے ہیں تو بلالاؤ احتشام صاحب قریب ہی بارودخانے میں رہتے تھے۔ احتشام صاحب آئے تو ان کیساتھ اعظم حسین صاحب بھی آگئے جو روزنامہ سرفراز کے اڈیٹر تھے حسینی صاحب نے نہایت زوردار لفظوں میں ہماری وکالت کی اور مجھ سے اصرار کیا کہ میں اپنی وہی نظم سناؤں میں نے نظم سنائی نظم اعظم صاحب نے لے لی کہ وہ اس کو سرفراز میں شائع کریں گے اور ہماری حمایت میں اداریہ بھی لکھیں گے احتشام صاحب مجھے آل انڈیا اسٹوڈنس فیڈریشن کے دفتر لے گئے وہاں انہوں نے مجھے علی سردار جعفری صاحب سے ملایا یہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری تھے یا صدر، اعظم صاحب نے ہماری تائید میں زبردست اداریہ لکھا، جعفری صاحب ہماری میٹنگوں میں آنے لگے اب ہمارے ایجی ٹیشن میں توانائی پیدا ہوگئی، حسین آباد وقف کے متولیوں نے ہماری مانگیں مان لیں اور تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ہماری اسٹرائیک ختم ہوئی لیکن میں اور میرے چند اور ساتھی سلطان المدارس سے نکال دیئے گئے، مولوی بننے کا خیال تو میں ترک کر ہی چکا تھا لیکن تعلیم جاری رکھی اور پرائیویٹ امتحانات دے کے اردو، فارسی اور عربی کے چند اسناد حاصل کیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ دبیر ماہر (فارسی) : لکھنؤ یونیورسٹی

۲۔	دبیر کامل (فارسی)	:	لکھنؤ یونیورسٹی
۳۔	عالم (عربی)	:	لکھنؤ یونیورسٹی
۴۔	اعلیٰ قابل (اردو)	:	الٰہ آباد یونیورسٹی
۵۔	منشی (فارسی)		الٰہ آباد یونیورسٹی
۶۔	منشی کامل (فارسی)	:	الٰہ آباد یونیورسٹی

سوچا یہ تھا کہ امتحانات پاس کر کے کسی کالج میں براہِ راست ایف۔اے میں داخلہ لے لوں گا اور انگریزی پڑھوں گا لیکن جب تک سیاست اور شاعری دونوں کا جنون بہت ترقی کر چکا تھا آگے تعلیم حاصل کرنے کے لئے جس نظم وضبط کی ضرورت تھی میرا لاابالی پن اس کو جھیل نہیں سکا اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

شاعری تو ایک طرح سے مجھے ورثے میں ملی تھی میرے والد باقاعدہ شاعر تو نہیں تھے لیکن ان کا شاعری کا ذوق بہت بلند تھا گھر میں اردو، فارسی کے دیوان بڑی تعداد میں تھے۔ میں نے یہ کتابیں اس عمر میں پڑھیں جب ان کا بہت کم حصّہ سمجھ میں آتا تھا مجھ سے بڑے تینوں بھائی باقاعدہ شاعر تھے یعنی صاحب بیاض بھی تھے اور صاحب تخلّص بھی سب سے بڑے بھائی سیّد ظفر حسین مرحوم کا تخلص مجروحؔ تھا۔ ان سے چھوٹے بھائی سید یوسف حسین کا تخلص بیتاب تھا۔

بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں علی گڑھ اور لکھنؤ سے گھر آتے تھے تو گھر پر اکثر شعری محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں بھائی صاحبان کے علاوہ قرب

و جوار کے شعرا شریک ہوتے بھائی صاحبان جب ابا کو اپنا تازہ کلام سناتے اور ابا سے داد پاتے تو مجھے بہت رشک ہوتا اور میں بڑی حسرت سے اپنے سے سوال کرتا کیا میں بھی کبھی شعر کہہ سکوں گا لیکن میں جب بھائیوں کے شعر سننے کے لئے کھڑا ہو جاتا یا چپ چاپ کہیں بیٹھ جاتا تو فوراً کسی بزرگ کی ڈانٹ پڑتی کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا گھر میں جاؤ اور پان بنوا کے لاؤ میں زمین پر پاؤں پٹکتا تقریباً روتا ہوا گھر میں باجی کے پاس جاتا کہ دیکھئے میرے ساتھ یہ ہوا میں ایک دن ان سب سے بڑا شاعر بن کے دکھا دوں گا باجی مسکرا کے کہتیں کیوں نہیں تم ضرور کبھی بڑے شاعر بنو گے ابھی تو یہ پان لے جاؤ اور باہر دے آؤ اسی عمر میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ابا بہرائچ میں تھے۔ قزلباش اسٹیٹ کے مختار عام یا پتہ نہیں کیا وہاں ایک مشاعرہ منعقد ہوا اس وقت زیادہ تر مشاعرے طرحی ہوا کرتے تھے اسی طرح کا ایک مشاعرہ تھا بھائی صاحبان لکھنؤ سے آئے تھے۔ بہرائچ، گونڈہ، نانپارہ اور قریب دور کے بہت سے شعراء مدعو تھے، مشاعرے کے صدر ماتی جائسی صاحب تھے ان کے شعر سننے کا ایک خاص طریقہ تھا کہ وہ شعر سننے کے لیے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھ جاتے اور اپنا سر اپنے دونوں گھٹنوں سے دبا لیتے اور جھوم جھوم کے شعر سنتے اور داد دیتے۔ اس وقت شعرا حسب مراتب بٹھائے جاتے ایک چھوٹی سی چوکی پر قیمتی قالین بچھا ہوتا اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا صدر اسی چوکی پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتا جس شاعر کی باری آتی وہ اسی چوکی پر آ کے ایک طرف نہایت ادب سے دوزانو ہو کے بیٹھتا، مجھے موقع ملا تو میں بھی اسی طرح ادب سے چوکی پر ایک کونے میں دوزانو بیٹھ کے اپنی غزل

جوطرح میں تھی سنانے لگا طرح تھی مہرباں ہوتا رازداں ہوتا وغیرہ میں نے ایک شعر پڑھا:

وہ سب کی سن رہے ہیں سب کو دادِ شوق دیتے ہیں
کہیں ایسے میں میرا قصہ غم بھی بیاں ہوتا

مآئی صاحب کو نہ جانے شعر اتنا کیوں پسند آیا کہ انہوں نے خوش ہو کے پیٹھ ٹھونکنے کے لئے پیٹھ پر ایک ہاتھ مارا تو میں چوکی سے زمیں پر آ رہا، مآئی صاحب کا منھ گھٹنوں میں چھپا ہوا تھا اس لئے انہوں نے دیکھا نہیں کہ کیا ہوا جھوم جھوم کے داد دیتے اور شعر مکرر مجھ سے پڑھواتے رہے اور میں زمین پر پڑا پڑا شعر دوہراتا رہا، یہ پہلا مشاعرہ تھا جس میں شاعر کی حیثیت سے میں شریک ہوا۔ اس مشاعرے میں مجھے جتنی داد ملی اس کی یاد سے اب تک کوفت ہوتی ہے۔ بزرگوں نے اس طرح میرا دل بڑھایا کہ واہ میاں واہ ماشاءاللہ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے کسی نے کہا زندہ رہو میاں کس اعتماد سے غزل سنائی ہے ہر آدمی یہ سمجھ رہا اور کسی نہ کسی طرح ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے میرے کسی بھائی نے غزل لکھ کے دے دی ہے جو میں نے اپنے نام سے پڑھی ہے۔ خیر ان بزرگوں کی ان خوش فہمیوں کی میں نے زیادہ پرواہ نہیں کی لیکن جب ابا نے بھی کوئی اس طرح کی بات کی تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں رونے لگا میرے بڑے بھائی شبیر حسین وفا، ابا بیٹوں میں جن کو سب سے زیادہ چاہتے تھے انہوں نے ابا سے کہا انہوں نے جو غزل پڑھی ہے وہ انہیں کی ہے شک دور کرنے کے لئے کیوں نہ ان کا امتحان لے لیا جائے اس وقت ابا کے منشی حضرت شوقؔ بہرائچی تھے جو

مزاحیہ شاعر تھے انہوں نے اس تجویز کی تائید کی مجھ سے پوچھا گیا امتحان دینے کے لئے تیار ہو میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہو گیا شوق صاحب نے مصرعہ دیا ''اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے'' بھائی صاحب نے کہا ان کے لئے یہ زمین بنجر بہت ہو گی کہ ایسی شگفتہ سی طرح تجویز کیجئے لیکن میرا اس وقت کا ایگو آج جسے اکثر تلاش کرتا ہوں میں نے کہا اگر میں غزل کہوں گا تو اسی زمین میں ورنہ امتحان نہیں دوں گا طے پایا کہ اسی طرح میں طبع آزمائی کروں میں اسی جگہ لوگوں سے ذرا الگ ہو کے دیوار کی طرف منھ کر کے بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر میں تین چار شعر ہو گئے آج ان شعروں کو دیکھتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں میرا کیا ہے پوری غزل میں وہی باتیں جو اساتذہ کہہ چکے تھے اس زمانے کا زیادہ کلام ضائع ہو گیا لیکن وہ پہلی غزل اس لئے زندہ رہ گئی کہ نہ جانے کہاں سے وہ بیگم اختر تک پہونچ گئی اس میں انہوں نے اپنی آواز کے پنکھ لگا دیئے اور وہ سارے ہندوستان، پاکستان میں مشہور ہو گئی لیجئے وہ غزل آپ بھی سن لیجئے یہ میری زندگی کی پہلی غزل ہے جو میں نے ۱۱ برس کی عمر میں کہی تھی۔

غزل

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
اک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے

اک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے

ساقی سبھی کو ہے غمِ تشنہ لبی مگر

مے ہے اسی کی نام پہ جس کے ابل پڑے

مدّت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ

میں خوش تو ہوگیا مگر آنسو نکل پڑے

اب اس غزل کو آپ پسند کریں یا نہ کریں خود میں بھی اب ایسی غزل نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی یہ افادیت ضرور ہے کہ اس نے لوگوں کا شک دور کر دیا اور سب نے یہ مان لیا کہ میں نے جو کچھ اپنے نام سے مشاعرے میں سنایا تھا وہ میرا ہی کہا ہوا تھا مانگے کا اجالا نہیں تھا، بہرائچ میں یہ غزل کہنے اور مشاعرے میں سنانے کے بعد جب لکھنؤ آیا تو سب نے یہ سمجھایا کہ اگر سنجیدگی سے شاعری کرنا چاہتے ہو تو کسی استاد کا دامن پکڑ لو کوئی بے استاد شاعر نہیں ہو سکتا ممکن ہے گونڈے بہرائچ میں ہو جائے لیکن یہ لکھنؤ ہے اس زمانے میں وہاں دو استادوں کا سکّہ چل رہا تھا حضرت آرزوؔ لکھنوی اور مولانا صفیؔ میں آرزو صاحب کے مقابلے میں صفیؔ صاحب کو زیادہ پسند کرتا تھا ہمت کر کے ان کے دولت خانے پر پہونچ گیا وہ مولوی گنج میں رہتے تھے، میں نے اطلاع بھجوائی صفی صاحب کا بڑا پن ملاحظہ فرمایئے کہ انہوں نے بلا لیا وہ ایک کھری چار۔ پائی پر لنگی باندھے اور بنیائن پہنے بیٹھے تھے میں پہونچا تو سر اٹھا کے میری طرف دیکھا اور آنے کی وجہ پوچھی میں نے عرض کیا میں آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہوں انہوں نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا اور پوچھا کچھ کہا ہے میں نے یہی غزل

سنائی مولانا صفؔی نے ہر ایک شعر پر سر ہلایا اور ہر شعر مکرر پڑھوایا اور داد دی ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ بہت تھا پھر انہوں نے پوچھا تمہاری عمر کیا ہے میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کے اپنا قد اونچا کر کے کہا ۱۱ برس، یہ سن کر وہ مسکرائے، انہوں نے کہا میری شاعری کی عمر اس وقت ۶۵ برس کی ہے اگر تمہارے کلام میں زبان اور بیان کی کوئی خامی ہو تو میں اسے ضرور ٹھیک کر سکتا ہوں لیکن ایسا کرنے میں تمہاری فکر کی گرمی بھی چلی جائے گی، ۱۱ برس کے سینے میں جو حدّت ہوتی ہے وہ ۶۵ برس کے سینے میں نہیں ہو سکتی تم ایک خاص عقیدت سے میرے پاس اصلاح کے لئے آئے ہو لیکن اصلاح کے بعد جب جاؤ گے تو کڑھتے ہوئے جاؤ گے کہ میری غزل خراب کر دی۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر واہ واہ سے گمراہ نہ ہو تو لکھتے رہو اور پڑھتے رہو شعر کی خامیاں خشک پتوں کی طرح گرتی جائیں گی اور خوبیاں نئی کونپلوں کی طرح پھوٹتی رہیں گی اسی مشورے کی روشنی میں میں نے اپنا ادبی سفر شروع کیا جو ابھی تک جاری ہے۔ اب تک میری نظموں اور غزلوں کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ جھنکار

۲۔ آخرِ شب

۳۔ آوارہ سجدے

۴۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)

آوارہ سجدے کی پذیرائی مختلف حلقوں میں مختلف ڈھنگ سے ہوئی۔ دلّی میں کوئی انوؔر دہلوی صاحب ہیں انہوں نے اور شاہی امام نے آوارہ سجدے

کے خلاف جہاد چھیڑ دیا کتاب ضبط کرنے اور مجھے جیل میں ڈالنے کا مطالبہ شروع ہو گیا رہبر دکھن اور سیاست جدید کانپور نے بھی اپنی سخن فہمی کا بے شرمی کے ساتھ مظاہرہ کیا اتر پردیش اردو اکادمی نے اس کو اس سال کی سب سے بہتر کتاب گردانا اور اپنا پہلا ایوارڈ دیا اسی کتاب پر مجھے سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ بھی ملا، آوارہ سجدے پر مجھے ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی ملا جو میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہے، مہاراشٹر اردو اکادمی نے بھی ایک خصوصی ایوارڈ دیا میری مجموعی ادبی خدمات پر مجھے لوٹس ایوارڈ بھی ملا یہ ایوارڈ افروایشین رائٹرز کمیٹی کی بین الاقوامی جیوری دیتی ہے، میں نے اب تک یہ احتیاط کی تھی کہ جو نظم کسی ایک کتاب میں آجائے وہ دوسرے مجموعے میں شامل نہ کی جاء اس سے یہ نقصان ہوا کہ بعض اہم نظمیں اہل نظر تک نہیں پہونچ سکیں اس لئے سرمایہ میں جھنکار، آخر شب اور آوارہ سجدے کی زیادہ تر نظمیں جمع کردی گئی ہیں لیکن یہ کلیات نہیں ہے اب بھی میری بہت سی نظمیں اور غزلیں ادھر اُدھر بکھری ہوئی مل جائیں گی ان کو تلاش کر کے اس مجموعے میں شامل کر دیتا تو اس کی ضخامت ضرور بڑھ جاتی لیکن شاید قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔

اس مجموعے کی اشاعت پر مجھے جن احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے ان میں

۱۔ ایک ہمالیاتی شخصیت مقبول فدا حسین کی ہے جنھوں نے اس مجموعے کا سرِ ورق بنایا اور میرا چہرہ بھی جس کو دیکھ کے پہلی مرتبہ مجھ کو میرے خط و خال اچھے لگے۔

۲۔ ڈاکٹر صادق نے اس مجموعے کی تزئین میں بہت حصّہ لیا میں ان کا

شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صادق سے جب جب ملا ہوں میں نے زیر لب یہ مصرع دہرایا ہے۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری ان کی مشہور کتاب "ترقی پسند افسانہ" پڑھ کے ترقی پسندی پر میرا عقیدہ اور مضبوط ہوگیا۔

۳۔ اس کتاب کی تزئین میں سلیمہ ہاشمی کا بھی حصہ ہے ان کا شکریہ تو نہیں ادا کرتا ہوں ہاں ڈھیروں پیار بھیجتا ہوں۔

۴۔ جیسی یہ کتاب ہے ایسی کتاب کے لئے احباب بہت دنوں سے تقاضہ کر رہے تھے لیکن تین چار مجموعوں کی نظموں اور غزلوں کو نقل کرنے کے لئے کسی فرہاد کی ضرورت تھی، جو بے ستوں کاٹ کے جوئے شیر لا سکے یہ فرہاد مجھے اپنے ہی گاؤں کے پڑوس یعنی سرائے میر میں مل گیا یہ ہیں نوجوان ہوشیار شاعر رشید انصاری سلمہ جن کی داڑھی دیکھ کے میں ہمیشہ اس الجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ وہ اصلی ہے یا وِگ ہے بہت سی دعاؤں کے ساتھ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کتاب کا نام

۵۔ میں نے اور میری بیوی نے اپنی ملی جلی کوشش سے صرف دو بچے پیدا کئے، بچے پیدا کر لئے لیکن نام رکھنے کی صلاحیت مجھ میں تھی نہ میری بیوی میں۔ بیٹی تقریباً ۱۱ برس کی ہوگئی تھی تب تک ہم میاں بیوی اس کو صرف منّی کہتے رہے۔ ایک دن سردار جعفری صاحب نے ہم دونوں کو ڈانٹا کہ یہ منّی منّی کیا کرتے رہتے ہو کوئی ڈھنگ کا نام رکھو شوکت نے

جعفری صاحب سے کہا آپ ہی کوئی نام تجویز کیجیے۔ جعفری صاحب نے بہت سے نام تجویز کئے ان میں سے ہم سب نے شبانہ پسند کیا اور اس طرح منّی شبانہ بن گئی۔ اس کے بعد ہم میاں بیوی بیٹے کے نام کے لیے پریشان ہوئے اس کی آپا اس کو بابا کہتی تھی ہم بھی یہی کہتے تھے۔ ایک دن میرے ایک نوجوان دوست مسعود صدیقی جو عربی کے پروفیسر تھے اور اس وقت سعودیہ میں عربی پڑھا رہے ہیں انہوں نے بابا کو احمر اعظمی بنا دیا ہم نے اس کے بعد پھر کوئی بچہ پیدا ہی نہیں کیا کہ پھر نام رکھنا پڑے گا۔ اتنی ہی پریشانی اس کتاب کے نام کی تھی چونکہ مجھے اپنی صلاحیتوں کا تجربہ تھا اس لئے میں نے ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے دوستوں ادیبوں سے فرمائش کر رکھی تھی کہ میری نئی کتاب کے لئے کوئی نام تجویز کر دیجئے۔ میری یہ مشکل میرے نوجوان دوست اور ساتھی حسن کمال نے آسان کر دی اور کہا کہ اس مجموعے کا نام سرمایہ ہونا چاہئے۔ میں حسن کمال کا شکرگزار ہوں۔

۶۔ آخر میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا شکریہ سب سے پہلے ادا کرنا چاہئے تھا یہ جو حوصلہ مند نوجوان ہیں برادرم شاہد ماہلی جو خود ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں اور خوش مذاق ناشر بھی اور میرے ہم وطن بھی، میں ان کا شکریہ سب کے بعد ادا کر رہا ہوں اس کی تلافی ایسے ہو سکتی ہے کہ آپ ان صفحات کو یہاں سے پڑھنا شروع کیجئے۔

پس سخن

میں نے شاعری کیوں شروع کی شاعر کیسے بنا (اگر آپ مجھے شاعر سمجھتے ہیں) اس کی تحقیق کے لئے کسی محقق کی ضرورت نہیں۔ میں نے جس گھر میں جنم لیا اس میں شاعری رچی بسی ہوئی تھی لیکن سیاست سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی اس کو سمجھنا اور سمجھانا میرے لئے بھی مشکل ہے میں جس گاؤں میں پیدا ہوا اور ابتدائی زندگی جہاں گزری وہاں باہر کی ہوا بھی مشکل سے آتی تھی۔ شہروں میں کیا ہو رہا ہے، کانگریس کیا کر رہی ہے مسلم لیگ کیا کر رہی ہے اس کا ذکر بھی وہاں نہیں آتا تھا، بزرگوں سے میں نے سنا ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے نیل کی کاشت شروع کروائی تو ہمارے گاؤں میں بھی نیل کے بیج آئے اور کارندوں کی زبانی پیغام بھی آیا کہ جو گیہوں بونا چھوڑ دو نیل کی کھیتی شروع کر دو تو کمپنی بہادر تم کو مالا مال کر دے گی میرے دادا مرحوم نے جب یہ سنا تو انہوں نے رازدارانہ طور پر گاؤں والوں کو سمجھایا کہ دیکھو کمپنی ہمارے کاریگروں کے انگوٹھے کاٹ کر ہماری صنعت اور تجارت کو ٹھکانے لگا چکی ہے اب کھیتی باڑی کو بھی تباہ کرنا چاہتی ہے اس لیے چپکے چپکے ان بیجوں کو بونے سے پہلے بھون ڈالو، بھُنے ہوئے بیج اُگ نہیں سکتے اور جب وہ اُگیں گے نہیں تو کمپنی یہ سمجھے گی کہ اس گاؤں کی زمین نیل کی کھیتی کے لئے مناسب نہیں اور ہم کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی دادا مرحوم نے خود یہی کیا اور ان کے مشورے پر کچھ اور لوگوں نے ایسا ہی کیا جب نیل کے بیج اگے نہیں تو کمپنی یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی کہ اس گاؤں کی زمین اچھی نہیں ہے لیکن کچھ دنوں میں یہ بات سب کو معلوم ہو گئی کہ کسانوں نے نیل کے بیج

میر عطا حسین کے کہنے پر بھون ڈاے تھے دادا مرحوم پر مقدمہ چلا جائداد ضبط ہوئی لیکن اس کے بعد کمپنی نے ہمارے گاؤں کے لوگوں کو نیل بونے پر مجبور نہیں کیا دادا مرحوم نے کمپنی کے خلاف نفرت کا جو بیج نیل کے کھیتوں میں بویا تھا وہ ایک دن میرے سینے میں پھوٹا اور پھولا پھلا۔ میری عمر کوئی ۹۔۱۰ برس کی ہوگی جب میں نے سنا کہ ہماری تحصیل میں ایک گورا کلکٹر آ رہا ہے جس نے اعظم گڑھ کے زمینداروں کو بہت ستایا ہے جو بندوبست ہو جائے بہت نفرت کرتا ہے میں نے اپنی ہی عمر کے لڑکوں کو جمع کیا بہنوں کو کالے دوپٹے چرا کے پھاڑے اور کالے جھنڈے بنائے اور چوری چوری تحصیل پہونچ گئے کہ جب وہ بندر آئے گا تو ہم اس کو کالے جھنڈے دکھائیں گے کلکٹر بہت دیر میں آیا تھا تھانے دار جو ابا کے پا س اکثر آتا تھا اس نے ہم کو دکھ لیا اور مجھے پکڑ کے ابا کے پاس لایا ابا کسی غیر کے سامنے ہم کو کبھی نہ ڈانٹتے تھے نہ مارتے تھے لیکن انہوں نے ہم کو سمجھایا بہت کہ اب ایسا نہ کرنا انہیں دنوں کی بات ہے کہ ہم جنگل میں گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک ببول کے درخت میں کہیں ایک چٹکی روئی اڑ کے آئی اور کانٹوں میں پھنس گئی ہے میں نے انگلیوں کو کانٹوں سے بچاتے ہوئے وہ روئی نکال لی اب میں اور میرے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہے اور سوچ رہے تھے کہ ببول میں روئی کہاں سے آگئی کچھ دور پر آم کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ آدمی زمین پر کمبل بچھائے لیٹا سو رہا تھا، میں روئی لئے اس کے پاس پہونچا اور روئی دکھا کے اس سے پوچھا کہ چاچا ببول کے پیڑ میں روئی کہاں سے آگئی وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے ہم کو سمجھایا کہ بابو جب سے

مہاتما گاندھی نے چرخہ کاتنا شروع کیا ہے بھگوان بھی ہر جگہ روئی پیدا کرنے لگا ہے میں سر کھجانے اور سوچنے لگا کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ گاندھی جی چرخہ کاتتے ہیں، اس وقت کا ہندوستان ایسا ہی تھا لیکن میرے گھر پر سیاست کا سایہ نہیں پڑا ایک بات جس پر مجھے فخر ہے جو قابلِ ذکر بھی ہے کہ میرے گھر پر کبھی فرقہ پرستی کا بھوت نہیں منڈلایا بھائی صاحبان جب چھٹیوں میں آتے تو ان کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کی خبریں بھی آتیں، کبھی کھانے پر یا چائے پر گاندھی جی اور ان کی بکری کی بات چھڑتی یا یہ کہانی کہ جواہر لال نہرو کے کپڑے پیرس سے دُھل کے آتے ہیں، مجھے ان باتوں میں دلچسپی تو بہت تھی لیکن کوئی روشنی نہیں ملتی تھی جب لکھنؤ آیا وہاں سوراج کا اندولن بہت زوروں پر چل رہا تھا۔ میں پربھات پھیریوں میں شامل ہو گیا، منہ اندھیرے کسی پربھات پھیری میں شامل ہوتا اور نظمیں پڑھتا اس مجموعے میں جھنکار کی جو نظمیں ہیں مثلاً ''اُٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے'' یہ ایک پربھات پھیری کے لئے میں نے کہی اور اسی میں پڑھی تھی، شہر میں ستیہ گرہ بھی ہو رہی تھی بدیشی کپڑے دوکان سے نکال کے جلائے جا رہے تھے۔ امین آباد میں کپڑوں کی ایک بہت بڑی دوکان تھی اس میں سے بدیشی کپڑوں کے تھان نکال کے سڑک پر جلائے جا رہے تھے میں بھی اس دلچسپ کام میں شریک ہو گیا تھوڑی دیر میں پولیس آ گئی اور ہم سب پکڑے گئے میں بھی جب ایک حولدار نے میرا بازو پکڑ کے مجھے اپنی لاری میں بٹھایا تو میں نے دیکھا کہ میرے محلّے کا ایک لڑکا کچھ دور سائیکل روکے کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے میں نے پکار کے اس سے کہا میرے گھر میں بتا دینا کہ میں جیل جا رہا ہوں

اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں گاندھی جی اور جواہر لال کی صف میں شامل ہو گیا نشہ اس وقت اُترا۔ جب عالم باغ پہونچ کے لاری رکی اور پولیس نے مجھے اور میری عمر کے کچھ اور لڑکوں کو اتار کے ہلکی سی ہماری کیننگ کی اور چھوڑ دیا بس اب گھر بھاگ جاؤ، میرا دل ٹوٹ گیا میں سیدھا امین آباد کانگریس کے دفتر میں پہونچا اور میں نے پولیس کی شکایت کی کہ مجھے پولیس جیل نہیں لے گئی اب میں؟ اپنے گھر جا کے کیا بتاؤں گا ایک بزرگ لیڈر نے مجھے بہت تسلّی دی ابھی تم بہت کم سن ہو لیکن جیل جانے کا اتنا شوق ہے تو کام کرتے رہو کسی دن جیل چلے ہی جاؤ گے، میں آنسو بھرے ہوئے گھر لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ ایسا کام کرنا چاہئے کہ ضرور ہی جیل جاؤں۔ ہمارے گروپ میں ایک بنگالی نوجوان بھی تھا اس نے ہم کو بم بنانے کا نسخہ دیا، ہم نے بم بنایا اور طے کیا کہ وزیر گنج تھانے پر ہم بم پھینکیں گے جس کے انسپکٹر نے ہم کو چھوڑ دیا خیریت یہ ہوئی کہ جب بم تیار ہو گیا تو مجھے یہ فکر ہوئی کہ تھانے پر پھینکنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بم بنا بھی ہے یا نہیں ہم لوگ گومتی کے کنارے شمشان گھاٹ کی طرف گئے اور وہاں سناٹے میں ہم نے بم کو آزمائش کی تو معلوم ہوا کہ وہ انار بن گیا (آتش بازی والا) میں نے اپنے بنگالی دوست کو خوب گالیاں دیں مار پیٹ بھی ہوئی اور اس کو اپنے گروپ سے نکال دیا۔

بہت دنوں تک اسی طرح بھٹکتا رہا۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس وقت ایک ایسا رومانک حادثہ ہوا کہ میں لکھنؤ چھوڑ کے کانپور چلا گیا وہاں مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہوا وہ چوری چوری مجھے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینے لگے اب مجھے وہ راستہ مل گیا جس پر میں نے زندگی کا اتنا لمبا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہو جانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہو جائے گا منزل پر یا منزل کے قریب۔

کیفی اعظمی

۷ر نومبر ۱۹۸۹ء

(زیر طبع مجموعہ کلام ''سرمایہ'' سے)

کیفی اعظمی: دانشوروں کی نظر میں

کیفی اعظمی ابتدا سے ہی اپنے سوشلسٹ نظریات اور ترقی پسند رجحانات کے سبب ہمارے مقتدر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنی شاعری کے ذریعہ یک جہتی، مساوات، اخوت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا درس دیتے رہے اور دبے کچلے طبقوں کی فلاح و بہبود کے لئے برابر جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر اپنے نظریات اور اصولوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود تمام سیاسی حلقوں میں ان کو بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے انتقال کی خبر اُردو کے اخباروں نے ہی نہیں، ہندی اور انگریزی کے تمام اخبارات نے بھی نمایاں طور سے شائع کی اور ان کے انتقال کو ملک وقوم کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیا۔ اُن کی رحلت پر متعدد اکابرین اور مشاہیر ادب نے ان کے فن اور شخصیت کو سراہتے ہوئے انہیں خارج عقیدت پیش کیا ہے ان میں سے چند کے اقتباسات یہاں

پیش کیے جارہے ہیں۔

(۱)

کیفی ایک عوام دوست شاعر ہی تھے لیکن ان کی وفات پر گویا سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ ہر طبقہ، ہر مذہب اور ہر علاقہ کے لاکھوں انسانوں نے انہیں دل کی گہرائی سے خراج تحسین ادا کیا۔ اور ہر شہر میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ ایسا لگا جیسے وہ محض پُر وقار جادوئی آواز رکھنے والے ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک قومی ہیرو تھے۔ جنہوں نے اپنے اشعار اور اپنی آواز سے لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرمایا اور اُن کے ضمیر کو جگایا۔

پروفیسر قمر رئیس

(۲)

کیفی اعظمی کا شمار ایسے ہی ترقی پسندوں میں ہوتا ہے جنہوں نے ابتدا سے ہی اپنے گھر کے زمیندارانہ ماحول، ظلم و جبر کو نہ صرف ناپسند کیا بلکہ اس نظام سے انحراف کرتے ہوئے احتجاج کا راستہ اپنایا۔ دس گیارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انہیں ماحول کی فرسودگی وکہنہ پرستی، زمیندارانہ نظام کی سختیوں، قید و پابند کا احساس ہوگیا۔ مذہبی گھرانہ تھا۔ گھر میں علم و ادب اور شعر وسخن کے چرچے تھے، چنانچہ فطری طور پر کم عمری سے ہی ان کا رجحان بھی شاعری کی طرف ہوا۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

(۳)

اردو شعر وادب میں کیفی اعظمی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں اردو

شاعری سے ان کا رشتہ نصف صدی سے بھی زیادہ کا ہے۔ اس نصف صدی کے ہنگامہ خیز حالات میں وہ اور ان کی شاعری نہایت صبر آزما مراحل سے گزری ہے۔ کبھی روایت پرستوں نے اُن پر انگلیاں اٹھائیں تو کبھی مذہب کے نام نہاد شیدائیوں نے ان پر زبردست حملے کیے کبھی ترقی پسند تحریک کے مخالفوں نے انہیں اپنا ہدف بنایا تو کبھی جدیدیت کے دعویداروں نے ان پر خاک اڑائی تو کبھی قانون کے محافظوں نے ان پر قدغن لگائی اور تو اور خود ترقی پسند ناقدین اور مبصرین نے بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اس کے باوجود کیفی اعظمی اپنے ضمیر اور فن کے تئیں ایمانداری اور خلوص کا رویہ اختیار کر کے اپنی رنگارنگ عظیم تہذیب، متعصبانہ سیاست کا شکار ہوتی ہوئی اپنی مظلوم لیکن زندہ پائندہ زبان اور اس کے شعر و ادب کی قابلِ قدر روایات اور اپنے عہد کے انسان کی آواز بن گئے۔

شاہد ماہلی

اس عہد کے شاعروں میں سب سے زیادہ مانوس اور دل ربا شخصیتیں جاں نثار اختر، مجاز، مخدوم اور کیفی کی تھیں۔ ان میں کسی طرح کا تصنع نہیں تھا اپنے ہم چشموں میں ہوں، مشاعرے کی محفل میں یا طالب علموں کے ہجوم میں، ان کا رویّہ بہت دوستانہ ہوتا تھا۔ شہرت اور مقبولیت نے بعض کے گرد تصنع کا اور افسانویت کا ایک دائرہ سا کھینچ دیا تھا لیکن یہ اصحاب ایسے پوز اور ہر سحر سے آزاد تھے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ ان کی ترقی پسندی کا خمیر ان کی اپنی مٹی سے اٹھا ہے اور جس تصور میں یہ یقین رکھتے ہیں، اپنی زندگی میں اسے برتتے بھی

ہیں۔ کیفی صاحب کی طبیعت میں رکھ رکھاؤ تو تھا لیکن ایک خلقی سادگی بھی تھی۔ لہجے میں تھوڑا سا پُور بیاپن، ایک قصباتی وضع اور ایسی کیفیت گویا کہ جیسے کچھ ہیں، ظاہر ہیں یہی انداز ان کی شاعری کا تھا انہیں سطح کے اوپر تیرتی ہوئی حقیقتوں، انسانی صورت حال کی ٹھوس اور ارضی بنیادوں، جیتی جاگتی سچائیوں کے بیان سے غرض تھی۔

پروفیسر شمیم حنفی

(۵)

اس عہد کے شاعروں کی طرح کیفی بھی اپنے خیالات کو زبان کا لباس پہنا کر ہندوستان کو دکھاتے رہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر انہوں نے خود کو عوام کے جذبات سے ہم آہنگ کرنا چاہا یا یوں کہیے کہ عوام کو اپنے احساسات تحفے کے طور پر دیے۔ انہوں نے اپنے نظریات کے اظہار کے لیے شاعری اور تھیٹر کو وسیلہ بنایا تھا اور آخری سانس تک ان کی صدا غفلت شکن بن کر کانوں میں گونجتی رہی۔

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

(۶)

کیفی اعظمی کا شعری سرمایہ جذبی اور مجاز کے علاوہ اپنے سارے ہم عصر شعرا سے کم اور سردار جعفری کے مقابلے میں تو بہت ہی کم ہے لیکن براہِ راست شاعری کا جو انداز، موضوع کے ساتھ مسلسل سفر اور از لب، خیر د بر ہول ریز د کی جو کیفیت ان کے یہاں ہے وہ دوسرے شعرا کے یہاں کم ہی ملتی ہے۔ نئی دنیا کو سلام، ایشیا جاگ اٹھا اور پتھروں کی دیواریں یقیناً براہِ راست شاعری کی عمدہ

مثالیں ہیں اور ان میں فکر کا ارتقا بھی ہے۔

عابد سہیل

(۶)

کیفی اعظمی کی شہرت و مقبولیت کے لیے دو متضاد عناصر اہمیت رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اُن کی رومانی اور جمالیاتی نظموں سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں کچھ ان کے انقلابی آہنگ اور اس ہیجان آمیز تصورات کے قائل ہیں جس کے ذریعے انہوں نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی، انسان دوستی کا پیغام پھیلایا، عام انسانوں کے ذہنوں میں آزادی کی عظمت کا شعور پیدا کیا، فرقہ وارانہ ذہنیت اور مذہبی تعصب کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کی اور ایسے نظام کی تشکیل کا نعرہ بلند کیا جس میں انصاف ہو اور ترقی کا جذبہ ہو اور ساری کائنات میں امن و آشتی، خوشی، سکون اور محبت و اخوت کے نغمے گونجتے رہیں۔

پروفیسر محمود الحسن

(۷)

مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری اور آل احمد سرور کے بعد کیفی اعظمی کی موت سے ایسا لگتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کا تختہ ہی الٹ گیا ہے اور دنیائے ادب میں ایک ہُو کا عالم محسوس ہو رہا ہے۔ ان کی رحلت ترقی پسند شاعری کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔

علی جواد زیدی

---

(۸)

کیفی اعظمی اُن ممتاز ترقی پسند شعرا میں سے تھے جنہوں نے ممبئی کو اپنا گھر بنایا اور فلموں کے ذریعہ بھی شہرت حاصل کی انہوں نے اپنی زندگی ہندوستانی محنت کشوں اور غریبوں کے واسطے جدو جہد کے لیے وقف کر دی تھی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(۹)

کیفی اعظمی کا انتقال اردو زبان کے لیے اور ہمارے سماجی اور سیاسی ماحول کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ وہ اپنی صحت کی خرابی کے باوجود اُردو زبان و ادب کی جس طرح خدمت کرتے رہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ کیفی اعظمی صرف ایک اہم شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ادب کی ترقی پسند تحریک کا ایک اہم ستون بھی تھے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

(۱۰)

کیفی صاحب ترقی پسند شاعروں کے آخری نمائندے تھے وہ ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انہوں نے گلستانِ سعدی کی طرز پر نئی گلستاں کے عنوان سے ایک کتاب لکھی وہ مرثیہ نگار بھی تھے۔

ڈاکٹر نیر مسعود

(۱۱)

ترقی پسند شعرا کی آخری کڑی بھی ہم سے جدا ہوگئی۔ کیفی اعظمی ایک

عظیم شاعر ہونے علاوہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ اپنے سینے میں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ آخر وقت تک فالج کے حملہ کے باوجود جس خوداعتمادی کا ثبوت دیتے رہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انہوں نے زندگی کے کسی موڑ پر ہار نہیں مانی۔ انہوں نے زندگی کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔

ڈاکٹر آصفہ زمانی

ماخوذ از کتاب:

کیفی اعظمی - عکس اور جہتیں

مرتبہ: شاہد ماہلی

شوکت کیفی

کیفی اعظمی: میرے ہم سفر

اعظم گڑھ یوپی کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں میں زمیندار مسلم شیعہ گھرانے میں پیدا ہونے والے لڑکے کا نام اطہر حسین رضوی رکھا گیا، باپ کا نام فتح حسین اور ماں کا نام کنیز فاطمہ تھا۔

اطہر حسین بچپن ہی سے انتہائی حساس طبیعت واقع ہوا تھا ان کی باجی کا کہنا تھا کہ اطہر نے بچپن سے ہی عید میں نئے کپڑے اس لئے نہیں پہنے کہ کسان بچوں کے پاس نئے کپڑے نہیں ہوتے تھے۔

ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی بچھن کی شرارتوں کا خمیازہ بھگتا، شرارت چھوٹا بھائی کرتا اور الزام اطہر پر آجاتا اور وہ بے چارہ بغیر قصور کئے ابا سے پٹتا اور منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا کہ ابا میرا قصور نہیں بچھن کا ہے۔

کوئی مہمان گھر میں آجاتا اور جب اس کے جانے کا وقت آتا تو یہی بچہ گھر کے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا روتا رہتا اور قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پوچھتا رہتا۔

چھ سات سال کی عمر میں ایک بار اکّہ پر گاؤں جاتے ہوئے اس کا BALENCE OUT ہوگیا (توازن بگڑ گیا) اور وہ اکّہ کے ساتھ لٹکتا ہوا ایک میل چلا گیا۔ لیکن اس نے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ جب پیچھے سے آتے ہوئے ایک شخص نے دیکھا تب وہ چلایا اور اکّہ رکا اور اس بچے کی جان بچی پیٹ اور ٹانگیں بالکل چھل چکی تھیں۔

اطہر کی ماں کا یہ حکم تھا کہ جب اطہر کھانا کھانے بیٹھیں تو ضرور کوئی نہ کوئی بہن اس کے پاس رہے تاکہ وہ بھوکے نہ اٹھ جائیں ۔

بڑی بہن واجدہ کا یہ بھائی بہت چہیتا تھا، چھ سال کی عمر ہی سے بڑی باجی رات کو سوتے وقت اپنے پاس لٹا لیتیں اور میر انیسؔ کے مرثیئے سنایا کرتیں ۔

گھر میں شعر و شاعری کا ماحول رہتا ابا اچھی غزل یا نظم کہنے والے بیٹے کو کوئی نہ کوئی بڑھیا سا انعام دیا کرتے تھے ان شعر کہنے والے بھائیوں میں اطہر شامل نہیں تھے، ان کا کام تھا اندر سے چاء اور پان لاکر مہمانوں کو پیش کرنا اور بھاگ بھاگ کر ان کی خاطر مدارات کرنا ۔

اس وقت اطہر کی عمر گیارہ سال کی تھی مردانے سے زنان خانے اور زنانخانے سے مردانے میں دوڑتا ہوا یہ بچہ آہستہ آہستہ شعر بھی کہتا جاتا ۔

ایک دن جب مشاعرہ شروع ہوا تو اس نے اپنے بڑے بھائی کے کان میں چپکے سے کہا کہ میں بھی اپنی ایک غزل پڑھنا چاہتا ہوں بھائی ذرا متعجب ہوئے پھر ابا سے اجازت دلوادی جب اس بچے نے اپنی غزل سنائی تو محفل سے اسے داد ملی (جس میں ابا بھی شامل تھے) "واہ واہ بڑی ہمت کی اتنے لوگوں میں غزل پڑھ دینا بھی بڑی ہمت کا کام ہے"

پھر ابا نے شبیر بھیا کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا (جس کا مطلب تھا کیا تم نے کہہ کر دی ہے)

حساس بچہ سمجھ گیا اور اپنے آنسو چھپانے کے لئے بھاگ کر زنانخانے میں آگیا جہاں تخت پر بیٹھی واجدہ باجی پان لگا رہی تھیں ۔

گھر میں اس کا صرف ایک ہی دوست تھا اور وہ تھیں واجدہ باجی، واجدہ باجی کے آگے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، روتے روتے اس نے کہا "دیکھئے باجی میں ایک دن ہندستان کا مشہور شاعر بنوں گا اور اس سے مجھے کوئی طاقت نہیں روک سکتی، اس وقت تو ابا سمجھے ہیں کہ یہ میری غزل شبیر بھیا نے کہہ کر دی ہے"۔

واجدہ باجی کو اپنے ننھے بھائی پر پیار آگیا اور گلے لگا کر بولیں "بابیٹی مرد ہو کر روتے

ہو ، چلو آنسو پوچھو اگر تم چاہو گے تو ضرور بڑے آدمی بنو گے، اب جاؤ یہ پان باہر دے آؤ۔"

اور پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ ایک مصرعہ طرح دیا گیا جس میں غزل کہنی تھی ۔

تمام بھائی بغلیں جھانکنے لگے اور اس لڑکے نے دو تین گھنٹوں میں یہ غزل کہہ ڈالی ۔

غزل کا مصرعہ طرح تھا "اتنا ہنسو کہ آنکھ سے آنسو نکل پڑے" اطہر کیفی نے یہ غزل کہی ۔

اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے
ہنسنے سے ہو سکون نہ رونے سے کل پڑے
جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے اشکِ غم
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے
مدت کے بعد اس نے جو کی لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

اس غزل نے پورا مشاعرہ لوٹ لیا۔ ابا دنگ رہ گئے فوراً ایک پارکر پن، ایک سرخ کی شیروانی کے ساتھ ایک عدد تخلص بھی دیا "کیفی" جو بعد میں کیفی اعظمی بنا ۔

اور پھر ابا نے عربی فارسی کی تعلیم کے لئے لکھنؤ بھیج دیا مولویوں کی صحبت کیفی نہیں جھیل سکے۔ دینی تعلیم سے ان کا جی اکھڑ گیا اور بمشکل تمام اپنی تعلیم ختم کی۔

بچپن سے ہی حساس طبیعت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی مصیبتوں، پریشانیوں، بھوک، افلاس سے بہت متاثر ہوتے تھے ۔

اس وقت روس میں انقلاب آچکا تھا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس کی تائید کر رہی تھی، کیفی کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "قومی جنگ" بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے جو مزدوروں اور کسانوں کی حمایت کرتا تھا۔

کیفی چپکے چپکے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ لکھ کر "قومی جنگ" کو بھیجنے لگے لیکن نظم پر نہ تو نام ہوتا تھا اور نہ ہی پتہ، اس کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے پی سی، جوشی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھے۔ یہ لوگ نظمیں دیکھتے اور حیران ہو جاتے کہ "یا اللہ اتنی خوبصورت نظمیں لکھنے والا شخص آخر

اپنا نام اور پتہ کیوں نہیں لکھتا کون ہے وہ" پھر سوچتے کہ شاید سرکاری ملازم ہے نام لکھتے ہوئے گھبراتا ہے۔

اور پھر لکھنؤ میں کیفی کی کھوج شروع ہوئی اور آخر ایک دن ایک مشاعرے میں سردار جعفری نے کیفی کو ڈھونڈ ہی لیا۔ سجاد ظہیر نے کیفی سے بمبئی چلنے کی فرمائش کی اور کیفی فوراً تیار ہوگئے، گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی "دہریوں کے ساتھ رہو گے نہ ان کا کوئی مذہب نہ ایمان تباہ ہو جاؤ گے" لیکن یہ ضدی بچہ اپنی بات پر اڑا رہا اور سردار بھائی اور بنے بھائی کے ساتھ بمبئی آگیا۔ یہاں پی، سی، جوشی اور پارٹی نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ پارٹی کے ہول ٹائمر ممبر ہوگئے یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے۔

یہاں سے کیفی مشہور ہونا شروع ہوئے۔ پارٹی نے کیفی کی نظموں کا پہلا مجموعہ "جھنکار" چھاپا جو ہاتھوں ہاتھ بک گیا، پھر ہندو مسلم فسادات پر چھوٹا سا کتابچہ "خانہ جنگی" چھپا۔ اب یہ ہندوستان کے تمام شہروں میں مشاعروں میں مدعو کئے جاتے اور خوب داد پاتے۔ اس زمانے میں ان کی انقلابی نظم "عورت" بہت مشہور ہوئی۔ یہ ناممکن تھا کہ کیفی کسی مشاعرے میں شرکت کریں اور "عورت" نظم سنائے بغیر آجائیں۔ بہت دن بعد جب ایک چھوٹی سی محفل میں وائی۔بی۔ چوہان نے یہ نظم سنی تو کہا تھا کہ "کیفی کو صدیوں زندہ رکھنے کے لئے صرف یہ ایک نظم ہی کافی ہے۔

عورت

قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج
حوصلے وقت کے اور زیست کے یک رنگ ہیں آج
آبگینوں میں تپاں ولولۂ سنگ ہیں آج
حسن اور عشق ہم آواز و ہم آہنگ ہیں آج

جس میں جلتا ہوں اسی آگ میں جلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

گوشے گوشے میں سلگتی ہے چتا تیرے لئے
فرض کا بھیس بدلتی ہے قضا تیرے لئے
قہر ہے تیری ہر اک نرم ادا تیرے لئے
رت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ کے رسم کے بت بند قدامت سے نکل
ضعف عشرت سے نکل وہم نزاکت سے نکل
نفس کے کھینچے ہوئے حلقۂ عظمت سے نکل
قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل
راہ کا خار ہی کیا گل بھی کچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

توڑ یہ عزم شکن سلسلۂ پند بھی توڑ
تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
توڑ پیمانۂ مردان خرد مند بھی توڑ

بن کے طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرہ پردیں
تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اٹھا جلد اٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اور پھر یہ ہینڈسم جوشیلا نوجوان شہر شہر گھومتا ہوا مشاعرے کے سلسلے میں حیدر آباد پہنچا، یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔

اس زمانے میں اختر حسن حیدر آباد کے ڈیلی نیوز پیپر "پیام" کے اڈیٹر تھے جو خود بھی ترقی پسند خیالات کے حامی اور اچھے شاعر بھی تھے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی بے حد خاطر کرتے کیفی سردار جعفری سلطانہ آپا اور مجروح سلطان پوری ان ہی کے مہمان ہوتے۔

حیدر آباد میں خاص طور پر WEMENS - COLLEGE (زنانہ کالج) میں کیفی کی تصویریں لڑکیوں میں پچیس ۲۵ تیس ۳۰ روپیوں میں بکا کرتی تھیں، کیفی لڑکیوں کے بہت محبوب شاعر تھے۔

مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا سامنے صوفے پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی اپنے بڑے بھائی خورشید علی خان اور بہنوئی اختر حسین کے ساتھ سحر زدہ سی بیٹھی اس نوجوان کی گرجدار آواز سن کر حیران ہو رہی تھی۔

اس زمانے میں نظام سرکار کا راج تھا، کسی کی ہمت نہیں تھی کہ نظام کو اعلیٰ حضرت کے علاوہ کسی اور خطاب سے مخاطب کر سکے اور یہ نوجوان گرج گرج کر نظام کے خلاف "تاج" نظم سنا رہا تھا ۔

"یہ وہ کشکولِ گدائی ہے جو بھرتا ہی نہیں"

(جھنکار میں بھی چھپی ہے)

نظم ختم ہوئی تو بھائی جان نے اپنی چھوٹی بہن کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "اتنی سی عمر میں یہ ہمت"

مشاعرہ ختم ہوا کیفی کو لڑکیوں نے گھیر لیا آٹوگراف کے لئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کیفی کی اس وقت کی پوزیشن کسی ہیرو سے کم نہیں تھی اور جب یہ دبلی پتلی لڑکی اپنی آٹوگراف بک لے کر ان کے پاس پہنچی تو کیفی نے شرارت سے ایک بہت ہی مہمل شعر اس پر لکھ دیا۔ اس لڑکی خود داری کو بہت ٹھیس پہنچی اور جب گھر پہنچی تو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس لڑکی نے شکایت کی "آپ نے ہماری آٹوگراف بک پر اتنا برا شعر کیوں لکھا"۔

کیفی مسکرائے اور اسی لہجے میں بولے "آپ نے سب سے پہلے ہم سے آٹوگراف کیوں نہیں لیا"۔ (کیونکہ اس لڑکی نے سردار جعفری اور مجروح سے پہلے لیا تھا) دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، آنکھوں نے آنکھوں سے کچھ کہا۔ کیفی کی اس نظم کی طرح ۔

شرارہ

دو نگاہوں کا اچانک وہ تصادم مت پوچھ
ٹھیس لگتے ہی اڑا عشق شرارہ بن کر
اڑ کے پہلے انھیں جھینپی ہوئی نظروں میں رکا
نرم، معصوم، حسیں، مست اشارہ بن کر
پھر نگہ سے عرق آلود جبیں پر جھلکا
پنکھڑی پھول گہر لعل ستارہ بن کر

ڈھل کے ماتھے سے اتر آیا گُلِ عارض میں
رنگ رس شہد نہیں ان سے بھی پیارا بن کر
گُلِ عارض سے سمٹ آیا لبِ رنگیں میں
راگ ہے لہر نہیں برق کا دھارا بن کر
لبِ گل رنگ سے پھر رینگ گیا باہوں میں
بس کے باہوں کی گدازی میں چلا دل کی طرف
چاہ، الطاف، کرم، پیار، مدارا بن کر
دل میں ڈوبا تھا کہ بس پھوٹ پڑا رگ رگ سے
جانِ دل، جانِ نظر، جانِ نظارا بن کر
پیکرِ حسن سے پھر اڑ کے چلا میری طرف
ایک بدمست جوانی کا اشارا بن کر
رہزنِ ہوش مگر ہوش کا پیغام لئے
دشمنِ ضبط مگر ضبط کا یارا بن کر
درد ہی درد مگر وجہِ سکوں وجہِ طرب
سوز ہی سوز مگر جان سے پیارا بن کر
آتے ہی چھا گیا کھوئی ہوئی ہستی پہ مری
میری کھوئی ہوئی ہستی کا سہارا بن کر
اب شرارہ وہی اس کے لب و رخسار میں ہے
اور کیفی مرے تپتے ہوئے اشعار میں ہے

(جھنکار میں چھپی ہے)

اوران دو نگاہوں کے تصادم نے گھر والوں میں ایک ہنگامہ خیز تصادم پیدا کر دیا۔ مخالفت جھگڑے رونا دھونا ماں کہتیں "ہول ٹائم ہے بیتالیس روپے تنخواہ پاتا ہے بیوی کو کہاں سے کھلائے گا" بڑی بہن کہتیں "ایک پیر جیل میں ایک پیر باہر، بیوی

کو کہاں رکھے گا"

اور آخر کار سچی محبت کی فتح ہوئی لڑکی کے ابا جو بہت ہی معقول ذہن کے آدمی تھے یہ کہہ کر بمبئی سے آئے" زندگی اس کو گذارنی ہے ہم کو نہیں" گھر والوں کو یہ بھی نہیں چلنے دیا۔ کیفی کے مرجھائے ہوئے دل میں جان پڑ گئی، سجاد ظہیر اور رضیہ آپا نے مجبور کر کے اپنے گھر بلا لیا اور تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی موجودگی میں اس لڑکی کا نکاح کیفی سے پڑھوا دیا۔

نکاح میں ایک مشکل یہ تھی کہ لڑکا شیعہ تھا اور لڑکی سنی نکاح کے لئے بھی دو قاضیوں کی ضرورت تھی جن کا بلانا مشکل تھا جب قاضی نے پوچھا لڑکے کا مذہب، بنے بھائی مسکرا کر بولے "حنفی المذہب" بس نکاح ہو گیا چاروں طرف سے مبارک مبارک کی آوازیں آنے لگیں اور نہایت دلچسپ مشاعرہ شروع ہو گیا، جوش، مجاز سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد سب نے اپنی اپنی خوبصورت نظمیں اور غزلیں سنائیں اور شادی کی محفل کامیاب ہوئی اس زمانے میں کیفی کی نظموں کا نیا مجموعہ "آخر شب" چھپ رہا تھا۔ سردار جعفری نے شادی کے تحفہ کے طور پر ایک کاپی بہت خوبصورت جلد میں جلدی سے چھپوا کر لڑکی کو پیش کیا۔ اندر سردار جعفری نے لکھا تھا "موتی کے لئے" میرا گھر یلو نام

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں

اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے
کیفی

اور دوسرے صفحہ پر لکھا تھا

"شش کے نام"

"میں تنہا اپنے فن کو آخرِ شب تک لا چکا ہوں تم آجاؤ تو سحر ہو جائے"
کیفی

چنانچہ سحر ہو گئی اور "شش" شوکت بن کر ان کی زندگی میں آ گئی شادی کے بعد ہم اندھیری کمیون کے ایک کمرے میں آ گئے، کمیون کی دنیا میرے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی پیپل اور کٹھل کے بڑے بڑے پیڑوں سے گھری ہوئی یہ جگہ بہت خوبصورت تھی اور اس سے خوبصورت تھے وہاں کے لوگ، روشن دماغ، انسان دوست، کچلے ہوئے پریشان حال بھوکے انسانوں کے لئے ایک نئی دنیا بنانے کی دھن میں جدوجہد کرتے ہوئے لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ لیکن لگتا تھا کہ ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ سب ہی کامریڈ کامریڈ پکارے جاتے تھے، اس وقت کامریڈ کا مطلب تھا "مکمل آدمی"

صبح کمیون کے کچن میں چائے کا بڑا سا پتیلا چڑھا رہتا اور یہ کامریڈ جلدی جلدی اپنے المونیم یا تام چینی کے مگوں میں چائے کے اخبار سنبھال لیتے۔ پھر جلدی جلدی نہا دھو کر صبح دس بجے ہی دوپہر کا کھانا کھا کر جس میں ایک دال ایک سبزی چاول اور روٹی ہوتی المونیم کے برتنوں میں کھا پی کر اور اپنے برتن دھو کر رکھ دیتے اور پارٹی کے مختلف FRONTS پر نکل جاتے۔

میں نے جاتے ہی کچن کی ذمہ داری سنبھال لی اور کھانے کے مینو میں جہاں تک گنجائش ہوتی تبدیلی کرتی رہتی مثلاً کبھی کوفتے بنوا لئے کبھی میٹھے چاول کبھی "لوکا بھرتہ کبھی بگھارے بیگن وغیرہ۔ بس پھر کیا تھا سارے کامریڈ میرے نام کے نعرے لگاتے "کامریڈ موتی زندہ باد" "کامریڈ موتی کی جے ہو" اور پھر خاموش ہو کر کھانا کھاتے۔ ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی۔

کیفی کی پارٹی ویج صرف پینتالیس روپئے تھی جس میں تیس روپئے کھانے کے کٹ جاتے باقی رہے پندرہ تو اس میں سگرٹ اور ریلوے پاس کا خرچ میرے لئے کوئی پیسہ نہیں بچتا تھا پارٹی ویج مجھے نہیں مل سکتی تھی، مجھے پالنے کیلئے کیفی نے ایک ڈیلی نیوز پیپر میں پانچ روپئے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنی شروع کی کبھی کبھی تو مجھے ان پر رحم آنے لگتا

آنکھ کھلتے ہی انھیں یہ گھبراہٹ ہوتی کہ نظم لکھنی ہے ۔ اور فوراً کاپی پنسل لے کر بیٹھ جاتے ۔

ایک دن پی سی جوشی میرے کمرے میں آ گئے میں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی پیار سے کہا "بیٹھو بیٹھو" اور خود ایک اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئے پوچھا "آج کل کیا کرتی ہو" میں نے کہا "کچھ نہیں" پھر مسکرا کر بولے "تمہیں پتہ ہے کہ ایک اچھی بیوی بننے کیلئے کئی باتوں کی ضرورت ہوتی ہے" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا "ایک اچھی بیوی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائے نوکری کرے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرے اور پھر شوہر کے ساتھ پارٹی کا کام بھی کرے" کافی دیر تک میرے بارے میں پوچھتے رہے اور جب وہ اٹھ کر گئے تو میں نے اپنے اندر ایک عجیب و غریب طاقت محسوس کی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ایک اچھی بیوی بنوں گی، کام کروں گی پارٹی کا اور پیسے کمانے کا بھی ۔

اس زمانے میں کیفی نے مجھے ایک کتاب لاکر دی "انسان کا ارتقا" اسے پڑھ کر جو بہت سے جالے میرے ذہن میں لگے رہ گئے تھے وہ سب چھٹ گئے پھر میں نے اپنا ارادہ کیفی پر ظاہر کر دیا کیفی چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ مزدوروں میں کام کروں لیکن میں نے "انڈین پیوپلز تھیٹر" کا اسٹیج اپنے لئے چن لیا اور آج تک اس میں کام کرتی ہوں۔ آج کل تو کیفی اپٹا کے پریذیڈنٹ ہیں ۔

میں کمانے کیلئے ریڈیو ڈرامے میں بھی حصّہ لینے لگی کبھی فلم کی ڈبنگ مل جاتی۔ پارٹی نے کیفی کی دقت کو محسوس کیا اور "اپنا ادب" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دو سَو روپئے ماہوار وظیفہ مقرر ہوئے ۔

ہم دونوں مل کر پارٹی کی میٹنگوں میں شریک ہوتے جہاں کبھی سردار جعفری تقریر کرتے کبھی سجاد ظہیر اور کبھی کیفی، کیفی کا روز کا آنا جانا اور اٹھنا بیٹھنا مدنپورے کے مزدور علاقے میں تھا۔ وہیں کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر انہوں نے نظم "مکان" کہی تھی ۔

مکان

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو، میں بھی اٹھوں
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی
(آوارہ سجدے)

ان دنوں ہماری سب سے بڑی تفریح تھی چاندنی رات میں اندھیری اسٹیشن سے کھلی چھت کی وکٹوریہ میں بیٹھکر کیمون آنا اس پر ایک روپیہ خرچ ہوتا اس لئے یہ موقع صرف مہینے میں ایک ہی بار نصیب ہوتا تھا۔

اور کبھی جلوسوں میں شریک ہوکر کئی کئی میل پیدل چلتے "لال باوٹا زندہ باد، انقلاب زندہ باد، کمیونسٹ پارٹی زندہ باد، کسان مزدور کی جے ہو" کے نعرے لگاتے،

سنہ ۱۹۴۸ء کے ایک جلوس میں مجھے یاد ہے گولی بھی چلی تھی اور ہمارے "اپٹا" کا ایک ممبر مارا گیا تھا دینا پاٹھک، بلراج ساہنی کو پولیس نے بری طرح پیٹا تھا اور گھسیٹتے ہوئے جیل لے گئی تھی میرا دل پتے کی طرح دھڑک رہا تھا اور میں بھاگ کر ریل کے ایک مزدور کے گھر میں گھس گئی تھی، جہاں ایک مزدور عورت نے مجھکو پانی پلایا تھا اور اس کے شوہر نے مجھے گھر لاکر چھوڑا تھا

اور جب سنہ ۱۹۴۹ء میں بی ٹی رندیوے کا زمانہ آیا تو پارٹی انتہا پسندی کا شکار ہو گئی بہت سارے کامریڈ جیلوں میں ٹھونس دئے گئے جو بچ گئے وہ آہستہ آہستہ پارٹی سے الگ ہونے لگے اور پھر سنہ ۱۹۶۲ء کے چینی حملے کے بعد روس اور چین نظریاتی جنگ میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے، اس تقسیم سے کیفی کو بے انتہا تکلیف پہنچی زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن یہ نظم "آوارہ سجدے" اسی زمانے میں کہی ۔

آوارہ سجدے

اک یہی سوزِ نہاں کل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں

تم بھی محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی چارہ گری
محرمِ دردِ جگر تم بھی نہیں، تم بھی نہیں

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی تھی تمہاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

دور منزل تھی مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لئے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھکو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لے کے گیا شوقِ شہادت مجھکو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جُز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا ہے
کہدیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

(آوارہ سجدے ۱۹۶۲ء)

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سوشلزم سے کیفی کا یقین نہیں اٹھا ہے اسے

جو بھی بن پڑتا ہے کرتے ہیں ابھی تک پارٹی کا کارڈ ان کے پاس ہے۔
۱۹۴۹ء میں میں اپنے بچے کی پیدائش کے سلسلے میں لکھنؤ چلی گئی کیفی بھی میرے ساتھ تھے وہاں واجدہ باجی نے مجھے سب سے زیادہ پیار دیا۔
میرے سنی ہونے کے باوجود کیفی کے ابا اماں مجھے بے حد پیار سے ملے اسپتال کا خرچ اچھن بھیا (کیفی کے بڑے بھائی) نے اٹھایا وہیں کبھی اماں سے کبھی واجدہ باجی سے کیفی کے بچپن کے قصے سنے کیفی کے گاؤں مجواں میں بھی چار مہینے گذارے،
اتنے دن گاؤں میں رہنے کے بعد گاؤں سے میرا جی بھر گیا میں گاؤں میں رہنے کی بالکل عادی نہیں ہوئی، میرا بچپن حیدرآباد شہر میں گذرا البتہ کیفی اپنے گاؤں میں بہت خوش تھے وہیں سے تلنگانہ موومنٹ پر "تلنگانہ" نظم لکھ کر پارٹی کو بھیجی، کئی نظمیں انہوں نے اپنے گاؤں میں بیٹھ کر لکھیں، گرمی سخت پڑتی تھی ہمارے اندر کے کمرے میں چھت پر لگا ہوا ایک پنکھا ہوتا تھا کپڑے کا ہیں اور بچہ سوتے رہتے اور یہ اپنی میز کے قریب اپنے پیر سے پنکھے کی ڈوری باندھ لیتے اور اسے کھینچتے رہتے اور ہاتھ سے نظمیں لکھتے رہتے سوچتے رہتے کسی نے گاؤں کے لڑکوں سے یہ بات کہدی اب کیا تھا لڑکے ہاتھ سے پنکھا کھینچنے کی نقل اتارتے اور کیفی کو چھیڑتے (گاؤں میں بیوی کا کام کرنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا)
پھر میں کیفی کے پیچھے پڑ گئی کہ یہاں سے چلو "پیسہ ہمارے پاس ایک نہیں چلیں تو کیسے"، کیفی کہتے۔ پھر ہم کیفی کی چھوٹی بہن شبیری سے دو سو روپئے لیکر بمبئی آگئے،
یہاں نقشہ ہی بدل گیا تھا ہمارا پیارا اندھیری والا کمیون ٹوٹ چکا تھا سجاد ظہیر پاکستان بھیج دئے گئے تھے رضیہ آپا لکھنؤ شفٹ کر گئی تھیں سلطانہ آپا منے بھائی (سجاد ظہیر) کے گھر چلی گئی تھیں سلطانہ آپا نوکری بھی کرتیں اور پارٹی کا کام بھی کرتیں اور اب ان کا گھر کمیون بن گیا تھا۔ بہت سے لوگ تھے میں اپنے بچے کو لیکر حیدرآباد چلی گئی۔

کیفی اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف تھے پارٹی پر پابندی کی وجہ سے کانفرنس بمبئی میں نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کیفی نے سوچا کہ کانفرنس بھیونڈی میں کی جائے جو بمبئی سے تیس میل دور ہے اور زیادہ تر ہینڈ لوم پر کپڑا بننے والے مزدوروں کی بستی ہے۔

کیفی رات دن کام کر رہے تھے ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا میں اتنی خوددار ہوں کہ کبھی اپنے ماں باپ سے بھی ایک پیسہ نہیں مانگا۔ پھر انہیں دنوں میرا بچہ بیمار ہو گیا۔ میں اس کا ہومیوپیتھک علاج کراتی رہی جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بچہ تیرہ دن کی بیماری کے بعد چل بسا۔ ٹائیفائیڈ نمونیہ ہو گیا تھا۔ میری دنیا میں اندھیرا چھا گیا کیفی کو تار دیا گیا۔ کیفی فوراً آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے گئے۔

بمبئی میں میں سلطانہ آپا کے گھر میں رہنے لگی کیفی اور مہندر ناتھ کی انتھک کوششوں سے کانفرنس کامیاب ہوئی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا نیا مینی فیسٹو وجود میں آیا۔

کانفرنس کی مصروفیت میں تھوڑے دن تو گذر گئے لیکن بچے کی یاد میرے دل سے نہیں جاتی تھی ہر وقت روتی رہتی اس کا ایک چھوٹا سا کرتا اپنے پاس رکھتی اسے آنکھوں پر رکھ لیتی۔ بس اسٹاپ پر اگر کسی عورت کی گود میں ایک سال کا بچہ دیکھ لیتی تو اپنا بچہ یاد آجاتا اور پیروں میں اتنی سکت نہ رہتی کہ کھڑی رہ سکوں۔

مجھے سب سے زیادہ سہارا مہدی (کیفی کے بہت پیارے دوست) نے دیا بہت سمجھاتے رہتے اور پھر میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے غم کی وجہ سے بور نگ ہوتی جا رہی ہوں۔ انسان میں اپنے غم کو برداشت کرنے کی طاقت ہونی چاہئے تب ہی وہ کچھ کر سکتا ہے۔ لوگ بھی کسی کے غم کو زیادہ دن تک نہیں جھیل سکتے۔

پھر میں نے اپنے آنسو پوچھ ڈالے اور ہنسنے کی عادت ڈال لی اور پھر سے اپنا کام شروع کر دیا۔

اب کیفی انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے مجھے یاد ہے کہ جب کوئی کامریڈ چھپتے

چھپلتے مجھے ان سے ملانے لے جاتا تو خوشی سے میرا دل دھڑکنے لگتا۔ کبھی کبھی مہینوں بعد ملنا ہوتا ایک ماہ بعد اندھیری کے کسی گھر میں جب میں ان سے ملنے گئی تو میں نے انہیں پہچانا ہی نہیں۔ انہوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں میں نے دیکھتے ہی کہا "تو یہ ہے کیا شکل بنا لی ہے بالکل پولس کانسٹیبل لگتے ہو"، کیفی ہنس کر کہنے لگے "اسی لیئے تو جیل جانے سے بچا ہوا ہوں"

پھر جب شبانہ ہونے والی ہوئی تو پارٹی نے سخت مخالفت کی کہ کیفی انڈر گراونڈ ہیں اور شوکت کی کوئی آمدنی نہیں ہے، اس لئے بچہ نہیں ہونا چاہیئے اور ابارشن ضروری ہے، لیکن میں نہیں مانی میں نے صاف انکار کر دیا۔ میرا ایک بچہ مر چکا تھا اور مجھے دوسرے بچے کی سخت ضرورت تھی میں پھر اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی جہاں میری ماں نے مجھے بہت پیار سے رکھا اور وہیں شبانہ پیدا ہوئی۔

کیفی کو یہ فکر تھی کہ پہلا بچہ تو غربت کی نذر ہو گیا اب اس بچی کے لئے انہیں پیسہ کمانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فلموں میں گانے لکھنے شروع کر دیئے شاہد لطیف نے کیفی کی حالت دیکھتے ہوئے انہیں اپنی فلم "بزدل" کے لئے دو گانے دیئے "روتے روتے گذر گئی رات رے" "کاہے اب رے بلم" دونوں گانوں کا معاوضہ ایک ہزار روپئے دیا۔

اس زمانے میں عصمت آپا اور شاہد بھائی ہم دونوں کو بہت چاہتے تھے بلکہ جب شبانہ ہونے والی تھی میں بہت بیمار ہو گئی تھی خون کی کمی کمزوری تو عصمت آپا نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور میرا علاج کرایا۔

کیفی کی کوششوں سے ڈھمکر روڈ کی ایک بلڈنگ میں ہمیں ایک کمرہ مل گیا اور میں دو مہینے کی شبانہ کو لے کر اس کمرے میں آ گئی، کمرہ بہت ہی گندہ اور باتھ روم کامن تھا، بجلی بھی نہیں تھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ نوکری کروں گی اور زہرہ آپا سے (جو اس زمانے میں پرتھوی تھیٹر میں بھی کام کرتی تھیں اور اپٹا کے ڈراموں میں بھی بہت اچھی آرٹسٹ اور بہت رحم دل عورت ہیں) اپنا ارادہ ظاہر کیا وہ فوراً

مجھے پرتھوی تھیٹر لے گئیں جہاں پرتھوی راج جی مجھ سے بہت پیار سے ملے اور فوراً نوکری دیدی سو روپئے میری تنخواہ مقرر ہوئی پھر محبت سے کہنے لگے "ہمارا تھیٹر غریب ہے ہم پیسے زیادہ نہیں دے سکتے لیکن یہاں آپ کو پیار کی کمی نہیں ملے گی"

چنانچہ ایسا ہی ہوا میں اپنی دو مہینے کی بچی کو کمر پہ لاد کر تھیٹر لے جاتی اس کے گیلے کپڑے میک اپ روم میں سوکھنے کے لئے ڈالتی اور پاپا جی (سب لوگ انہیں پیار سے پاپا جی کہتے) ذرا بھی اعتراض نہیں کرتے تھے بالکل ایک باپ کی سی شفقت ان کی شخصیت میں بسی ہوئی تھی ۔

اسی طرح دن گذرتے گئے ۔ تین سال کی عمر تک تو میں شبانہ کو اپنے ساتھ پرتھوی تھیٹر کے ٹور پر لے جاتی رہی لیکن جب وہ تین سال کی ہوئی تو اس پڑھائی کا مسئلہ سامنے آیا ۔

کیفی چاہتے تھے کہ وہ اپنی بچی کو بڑے انگلش اسکول میں داخل کریں میں مخالفت کرتی تھی کہ بڑے اسکول کی فیس ہم کہاں سے دے سکیں گے لیکن کیفی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شبانہ کو بڑے اسکول ہی میں پڑھائیں گے چاہے انہیں کتنی ہی محنت کرنی پڑے پیسہ کمانے کے لئے ۔

اسی زمانے میں سلطانہ آپا ADULT EDUCATION کی انسپکٹرس تھیں اسکولوں میں ان کا آنا جانا رہتا تھا ایک دن جب وہ کوئن میری ہائی اسکول گئیں تو انہوں نے شبانہ کو اپنی بچی کہہ کر نام لکھوا دیا" ورنہ اچھے اسکولوں میں جگہ ملنی بھی مشکل تھی اور اس اسکول میں تو بغیر انگریزی پڑھے ماں باپ کے بچوں کو ہرگز نہیں لیتے ۔

وہاں یہ بچی اپنی ذہانت اور ملنسار طبیعت کی بدولت ٹیچرس کی بہت چہیتی ہو گئی اور ہر سال فرسٹ آنے لگی اس کی اچھی رپوٹ دیکھکر میری آنکھوں میں سلطانہ آپا کے لئے تشکّر کے آنسو چھلکنے لگے ۔

پھر آہستہ آہستہ کیفی کو فلموں میں کام بھی ملنے لگا اور وہ بچی کی فیس اور گھر کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئے مگر پارٹی کا کام انہوں نے پھر بھی

نہیں چھوڑا،

گرودت کی فلم "کاغذ کے پھول" موہن سہگل کی فلم "اپنا ہاتھ جگن ناتھ" ایک کے بعد ایک سب کے گانے لکھے کاغذ کے پھول کے گانے بہت مقبول ہوئے۔ اور رمیش سہگل کی فلم شعلہ و شبنم کا گانا

جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے

پھر بہت جلد ہم سے ریڈ فلیگ ہال چھین لیا گیا ہرکشن داس ہاسپٹل کو اس جگہ کی ضرورت تھی پارٹی کے لوگ کیس ہار گئے اور پھر ہم لوگ کیفی کی کوششوں سے جوہو کے اس کاٹیج میں آ گئے جس کا کرایہ دو سو بیس روپئے ہے اور ابھی تک یہیں رہ رہے ہیں۔

پھر کیفی کو ایک روز چیتن صاحب ملنے آ گئے اپنی فلم "حقیقت" میں ان کو گانے لکھنے کی آفر کی۔

"حقیقت" بہت ہٹ ہوئی اور کیفی مستقل طور پر چیتن صاحب کے ساتھ گانے لکھنے لگے۔ کیفی کے فلمی دنیا میں "دو کارنامے" ہیں ایک تو چیتن صاحب کی فلم "ہیر رانجھا" جو پوری منظوم فلم ہے اور دوسرا "گرم ہوا" جسے سیتھو نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ گرم ہوا کی کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کیفی کے ہی لکھے ہوئے ہیں اور انھیں فلم فیر کے تین ایوارڈ اکٹھے ملے کہانی، ڈائیلاگ اور اسکرین پلے کہانی کے لئے نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔

کیفی کی اب تک چار کتابیں چھپ چکی ہیں، "جھنکار" "آخرِ شب" "آوارہ سجدے" اور فلمی گیتوں کا مجموعہ "میری آواز سنو" "آوارہ سجدے" ان کا نیا انتخاب ہے "آخرِ شب" کے بعد انہوں نے بہت ساری نظمیں لکھیں لیکن اسے اس مجموعہ میں شریک کرنے کے قابل نہیں سمجھا اس مجموعے کو بہت سارے انعامات مل چکے ہیں، نہرو اوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ، یو پی اردو اکیڈمی اوارڈ،

آوارہ سجدے کی تمام شاعری، آخرِ شب کی شاعری سے کہیں زیادہ پختہ، کہیں زیادہ آگے ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اگر میں ن۔م راشد صاحب کی آخری سطریں جو انہوں نے فیض صاحب کے مجموعہ کلام نقشِ فریادی کے مقدمہ میں لکھیں ہیں کیفی کی شاعری کے لیے بھی دہرا دوں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

"فیض کسی مرکزی نظریئے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے اور اپنے شدید احساسات کو وہ اپنے حسین الفاظ کے ساتھ اس طرح پیوست کرتا ہے کہ وہ ایک ہی پیرہن کے تار پود معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

فرق صرف اتنا ہے کہ کیفی ایک مرکزی نظریئے کے بھی شاعر ہیں ترقی پسند شاعر ترقی پسند انسان بھی سچے آدمی جو دل میں وہی زبان پر اور وہی عمل میں بھی اور اسی سچے اور ترقی پسند آدمی کے ساتھ میں نے زندگی کا طویل راستہ طے کر لیا ہے انتیس ۲۹ سال ایک صدی کے چوتھائی حصے سے بھی زیادہ۔

شادی سے پہلے ایک بار میں نے کیفی کے سامنے ایک پیپر پر لکھ دیا تھا کہ "اگر زندگی کے اس طویل سفر میں تم میرے ہمسفر ہو جاؤ تو یہ زندگی اس طرح گذر جائے جیسے پھولوں پر سے نسیم سحر کا لطیف جھونکا"

اور میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ زندگی کے انتہائی اتار چڑھاؤ کے باوجود ایک کمرے کی زندگی کے باوجود کبھی کھانا ہے اور کبھی نہیں کے باوجود میں نے کبھی اپنے ماں باپ کو شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا میں نے کبھی اپنے آپکو دکھی نہیں محسوس کیا۔ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک انتہائی خوش قسمت عورت سمجھا اور آج بھی سمجھتی ہوں شاید میرے ہی لئے کیفی موت کی دہلیز کو چھو کر واپس آ گئے۔

۹ فروری ۱۹۷۳ء کو فالج کا اس قدر زبردست حملہ ہوا کہ زندہ رہنے کی

کوئی آس نہیں رہ گئی تھی، بارہ گھنٹے برین ہیمرج میں رہ کر کوئی واپس نہیں لوٹ سکتا اور کیفی لوٹ آئے میرے لئے میرے بچوں کے لئے میں ان کی انتہائی شکر گذار ہوں اور ساتھ ہی خدا کی بھی جس نے مجھ پر رحم کیا۔ اور میں سلطانہ آپا (سردار بھائی) کا احسان بھی کبھی نہیں بھول سکتی جنہوں نے میرا اتنا ساتھ دیا بریچ کینڈی ہاسپٹل میں داخل کرنے کا سہرا صرف ان کے سر ہے ورنہ وہاں داخلے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اور جب تک کیفی ہاسپٹل میں رہے ان دونوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھا اور سردار بھائی کی بہنوں کی بھی میں انتہائی شکر گذار ہوں ربو باجی اور ستارہ کی کہ ان لوگوں نے بھی میری دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

کیفی نے بھی موت سے ہار نہیں مانی مستقل اس سے لڑتے رہے۔

اسپتال کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ ایک دن سلطانہ آپا کے گھر سے سوا چار بجے ہاسپٹل پہنچی جہاں کیفی بے ہوش پڑے ہوئے تھے ان کے کمرے کے دروازے پر DON'T DISTURB کا بورڈ لگا ہوا تھا بیوی بھی چار بجے سے پہلے ان کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتی تھی، کیا دیکھتی ہوں کہ ایک طالب علم کیفی کے سرہانے بیٹھا اپنا دکھڑا سنا رہا ہے اور کیفی نیم بے ہوشی میں اپنے سر کے درد کے باوجود بڑے غور سے سن رہے ہیں میں یہ دیکھتے ہی جھلا گئی "حد ہو گئی ڈاکٹر نے آپ کو بات کرنے سے بھی منع کیا ہے اور آپ اس سے باتیں کر رہے ہیں" پھر میں نے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا "میاں تم ذرا باہر آؤ" وہ کسمسانے لگا "میں۔ میں کیفی صاحب کو اپنے حالات سنانا چاہتا ہوں" میں نے پیار سے کہا "ذرا آپ باہر آجائیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" لڑکا اٹھ کر باہر آنے لگا تو کیفی نے اپنی نحیف لڑکھڑاتی آواز میں کہا "موتی یہ اسٹوڈنٹ ہے اسے کچھ مت کہنا ہو سکے تو اس کی جو ضرورت ہے اسے پوری کر دینا" میں اچھا اچھا کہہ کر باہر نکل گئی پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ احمد آباد کا رہنے

والا ہے سوتیلی ماں کے ظلم سے گھبرا کر بھاگ آیا ہے۔ اور یہاں کام چاہتا ہے اور کیفی سے کام مانگنے آیا ہے۔"

ہاسپٹل میں جہاں کیفی کے چاہنے والوں کی ایک بھیڑ لگی ہوتی تھی جس میں اپنے پیارے دوستوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے وزیر صحت ڈاکٹر رفیق ذکریا گورنر علی یاور جنگ اور ان کی بیگم صاحبہ وغیرہ ہوتے تھے تو ایک طرف وہیں نیچے مالیوں کی قطار بیٹھی ہوئی تھی ملنے کی اجازت تو اتنے لوگوں کو نہیں مل سکتی تھی صرف صاحب کی طبیعت پوچھنے جو ہو سے آتے اور جاتے ہوئے کہتے "ہمارے دلوتا جیسے صاحب کو بھگوان اچھا کر دے۔"

ہاسپٹل میں پانچویں دن کیفی نے ایک نظم کہی "دھماکا" کیفی اپنی لڑکھڑاتی زبان میں کہتے جاتے اور شمع زیدی لکھتی جاتیں۔ اور میں دنگ رہ جاتی کتنی ہمت ہے کیفی میں کتنی جان ہے اور میں دل ہی دل میں ان کے زندہ رہنے کی دعائیں مانگنے لگتی۔

وہیں اسپتال میں انہوں نے دوسری نظم کہی "زندگی" آدھی نظم بریچ کینڈی ہاسپٹل میں کہی اور آدھی روس کے ہاسپٹل میں جہاں وہ علاج کے لئے ۱۹۷۴ء میں گئے تھے۔

زندگی

آج اندھیرا مری نس نس میں اتر جائے گا
آنکھیں بجھ جائیں گی بجھ جائیں گے احساس و شعور
اور یہ صدیوں سے جلتا سا سلگتا سا وجود
اس سے پہلے کہ مری بیٹی کے وہ پھول سے ہاتھ
گرم رخسار کو ٹھنڈک بخشیں
اس سے پہلے کہ مرے بیٹے کا مضبوط بدن
تن مفلوج میں شکتی بھر دے
اس سے پہلے کہ مری بیوی کے ہونٹ

میرے ہونٹوں کی تپش پی جائیں
راکھ ہو جائے گا جلتے جلتے
اور پھر راکھ بکھر جائے گی

زندگی کہنے کو بے مایہ سہی
غم کا سرمایہ سہی
میں نے اس کے لئے کیا کیا نہ کیا
کبھی آسانی سے اک سانس بھی پیراج کو اپنا نہ دیا

آج سے پہلے بہت پہلے
اسی آنگن میں
دھوپ بھرے دامن میں
میں کھڑا تھا مرے تلووں سے دھواں اٹھتا تھا
ایک بے نام سا بے رنگ سا خوف
مجھے احساس یہ چھایا تھا کہ جل جاؤں گا
میں پگھل جاؤں گا
اور پگھل کر مرا کمزور سا میں
قطرہ قطرہ مرے ماتھے سے ٹپک جائے گا

مار رہا تھا مگر اشکوں کے بغیر
چیختا تھا مگر آواز نہ تھی
موت لہراتی تھی سو شکلوں میں
میں نے ہر شکل کو گھبرا کے خدا مان لیا

کاٹ کے دکھ دیئے صندل کے پراسرار درخت
اور پتھر سے نکالا شعلہ
اور روشن کیا اپنے سے بڑا ایک الاؤ
جانور ذبح کئے اتنے کہ خوں کی لہریں
پاؤں سے اٹھ کے کمر تک آئیں
اور کمر سے مرے سر تک آئیں

سوم رس میں نے پیا
رات دن رقص کیا
ناچتے ناچتے تلوے مرے خوں دینے لگے
میرے اعضا کی تھکن
بن گئی کانپتے ہونٹوں پہ بھجن
ہڈیاں میری چٹخنے لگیں ایندھن کی طرح
منتر ہونٹوں سے ٹپکنے لگے روغن کی طرح

اگنی ماتا مری اگنی ماتا
سوکھی لکڑی کے یہ بھاری کندے
جو تری بھینٹ کو لے آیا ہوں
ان کو سویکار کر اور ایسے دھدھک
کہ نکیلے شعلے
کھینچ لیں جوش میں سورج کی سنہری زلفیں
آگ میں آگ ملے
جو امر کر دے مجھے

ایسا کوئی راگ ملے

اگنی ماں سے بھی نہ جینے کی سند جب پائی
زندگی کے نئے امکان نے لی انگڑائی
دفعتاً دور سے کانوں میں یہ آواز آئی

بدھم شرنم گاچھامی
دھمم شرنم گاچھامی
سنگھم شرنم گاچھامی

چار ابرو کا صفایا کر کے
بے سلے وستر سے ڈھانپا یہ بدن
پونچھ کے پتنی کے ماتھے سے دمکتی بندیا
سوتے بچوں کو بنا پیار کئے
چل پڑا ہاتھ میں کشکول لئے
چاہتا تھا کہ کہیں بھکشا میں جیون مل جائے
جو کبھی بند نہ ہو، دل کو وہ دھڑکن مل جائے
مجھ کو بھکشا میں مگر زہر ملا
ہونٹ تھرانے لگے جیسے کرے کوئی گلہ
جھک کے سولی سے اسی وقت کسی نے یہ کہا
تیرے اک گال پہ جس پل کوئی تھپڑ مارے
دوسرا گال بھی آگے کر دے
یہی جینے کا طریقہ بھی ہے انداز بھی ہے
تیری آواز بھی ہے، یہ مری آواز بھی ہے

میں اٹھا جسکو اہنسا کا سبق سکھلانے
مجھ کو لٹکا دیا سولی پہ اسی دنیا نے
آرہا تھا میں کئی کوچوں سے ٹھوکر کھا کر
ایک آواز نے روکا مجھکو
کسی مینار سے نیچے آ کر
اللہ اکبر، اللہ اکبر
ہوا دل کو یہ گماں
کہ یہ پرجوش اذاں
موت سے دیگی اماں
پھر تو میں پہنچا جہاں
میں نے دہرائی کچھ ایسے یہ اذاں
گونج اٹھا سارا جہاں
اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر
اسی آواز میں اک اور بھی گونجا اعلان
كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

اک طرف جھک گیا خورشیدِ جہاں تاب کا سر
ہوا فالج کا اثر
پھٹ گئی نس کوئی
شریانوں میں خوں جم سا گیا
ہوا مجروح دماغ
ایسا لگتا تھا کہ بجھ جائے گا صدیوں سے جو جلتا ہے چراغ
پھر سمندر جو بڑی دیر سے طوفان میں تھا

ایسا تڑپا کہ مرے کمرے کے اندر آیا
آتے آتے وہ مرے واسطے امرت لایا
اور کہا شیو نے یہ بھجوایا ہے
آج شیو علم ہے، امرت ہے عمل
اب وہ آساں ہے جو دشوار تھا کل
رات جو موت کا پیغام لئے آئی تھی
بیوی بچوں نے مرے، اس کو کھڑکی سے پرے پھینک دیا
اور جو وہ زہر کا اک جام لئے آئی تھی
اس نے وہ خود ہی پیا
صبح اتری جو سمندر میں نہانے کیلئے
رات کی لاش ملی پانی میں

ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے کہ ایک دن ہمارے گھر میں چوری ہوگئی تمام بیڈ کور، چادریں، کمبل چوری ہوگئے، مجھے معلوم تھا کہ چور کون ہے۔ ایک چور مالی ہمارے گھر کسی کے توسط سے آگیا تھا۔ جب ہمارے گھر میں مستقل چوریاں ہونے لگیں اور مجھے پتہ چلا کہ یہ سارا کام اسی مالی کا ہے تو میں نے اسے نکال باہر کیا اور ایک دن جب ہم لوگ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے اور گھر کھلا ہوا تھا تو موقع دیکھ کر وہ مالی پھر آیا اور گھر کے تمام کمبل چادریں اور بیڈ کور اٹھالے گیا۔ جب میں نے کیفی سے کہا کہ تم خدا کے لئے پولس میں اطلاع کردو کہ اس طرح چوری ہوئی ہے اور چور صرف وہی مالی ہے تو کہنے "دیکھو شوکت بارش ہونے والی ہے اس غریب کو بھی تو چادروں اور کمبل کی ضرورت ہوگی اس کے بچے کہاں سوئیں گے تم تو اور خرید سکتی ہو لیکن وہ نہیں" میں نے اپنا سر پیٹ لیا اب کیا جواب دیتی۔
ایک بار یہ لان میں بیٹھے لکھ رہے تھے، پھولوں پودوں سے انھیں بہت

پیار ہے اس کے لئے حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں دور دور سے پھولوں کے بیج منگواتے ہیں اس زمانے میں پھولوں کا موسم آنے والا تھا وہ گملوں میں پھولوں کے بیج لگا رہے تھے اتنے میں محلہ کی ایک مرغی اپنے دس بارہ چھوٹے چھوٹے بچوں سمیت آگئی اور پنجوں سے گملوں کا بیج کرید کرید کر کھانے لگی بچے بھی ماں کا ساتھ دینے لگے کیفی کو ایک دم غصہ آگیا اور انھیں بھگانے کے لئے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر ان کی طرف پھینکا وہ پتھر مرغی کے ایک بچے کو لگ گیا اور وہ وہیں تڑپ تڑپ کر دم توڑ گیا۔ بس پھر کیفی سے نہ رہا گیا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے مرغی کے بچے کو پانی پلایا کسی طرح زندہ رکھنے کی کوشش کی مگر جب وہ نہ بچ سکا تو ایک دم قلم بند کر کے رکھ دیا اور دو روز تک کام ہی نہ کر سکے۔

مجھ سے کہنے لگے "میں نے بہت زیادتی کی انھیں آواز سے بھی بھگا سکتا تھا، پتھر پھینکنے کیا ضرورت تھی، اب مجھ سے کام ہی نہیں ہو رہا ہے جب بیٹھتا ہوں وہ مرغی کا بچہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے" میں نے ہنس کر بالکل بچوں کے سے انداز میں سمجھایا بھئی یہ تو اتفاق سے ہوا اور پھر مرغی تم کھاتے بھی تو ہو اگر اب نہیں مرتا تو تھوڑا بڑا ہو کر کاٹ دیا جاتا تم اس کے بارے میں مت سوچو وغیرہ وغیرہ۔

کیفی کی عزت میری نگاہوں میں ان کی بیماری کے بعد کئی گنا بڑھ گئی اور وہ ہے ان کا WILL POWER ایک ہاتھ کے مفلوج ہونے کے باوجود انہوں نے بیماری سے ہار نہیں مانی ہر مشاعرے میں جاتے ہیں ہر میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں ایک مرتبہ بہار کے ایک شہر گیا میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس تھی ان لوگوں نے کانفرنس انتہائی گرمی کے مہینے میں رکھ دی کیفی نے فیصلہ کر لیا کہ میں جاؤں گا۔ میں بے حد ڈر گئی اچھے اچھے رائٹرس گیا کی گرمی سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن کیفی کی ضد ان کو گیا لے گئی وہاں سے وہ پٹنہ

پٹینہ کانفرنس میں بھی گئے وہاں تو ہم دونوں مرتے مرتے بچے اسٹیشن پر ایک لاکھ کسان واپس جارہے تھے اس میں، میں اور کیفی پھنس گئے اگر اس وقت ایک کسان اپنا ڈنڈا اٹھا کر ہماری مدد نہ کرتا تو لوگ ہم دونوں کو کچل کر آگے بڑھ جاتے۔

ایسے مشاعروں کے دعوت نامے قبول کر لیتے ہیں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا ہوگا۔

اپنے گاؤں سے بے حد پیار کرتے ہیں تمام زمین تو ماں باپ کے پاکستان جاتے ہی لوگوں نے ہڑپ کر لی جو تھوڑی بچی وہ کچھ لوگوں نے محبت کی وجہ سے واپس کر دی۔ کیفی ملیح آباد ٹرک پر بیٹھ کر گئے اور آم کے تین سو پودے لاکر اپنے سامنے اس زمین میں لگو لئے اب چاہتے ہیں کہ پھولپور اسٹیشن سے مجواں تک سڑک بھی بن جائے اور جب بھی کیفی کی کوششوں سے حکومت نے سڑک بنوانی چاہی گاؤں والوں نے اڑنگے لگانے شروع کر دیے پھر خود گاؤں گئے ایک ایک کو سمجھایا کہ "بھیا اس میں آپ ہی لوگوں کا فائدہ ہے سڑک بن جانے دو" پھر مجھ سے کہتے "بے چارے کسان بھی تو زمین کے سہارے پر زندہ رہتے ہیں ان کی اتنی زمین چلی جائے گی تو وہ کھیتی کس طرح کریں گے"۔

ایک بار ۱۹۷۸ء میں گاؤں کی اسی محبت میں پیر کا فریکچر بھی بہت بری طرح ہوا۔ ہوا یوں کہ کیلے کے تین سو پودے اپنے باغ میں لگوانے کیلئے بھساول سے خرید کر لکھنؤ پہنچے لکھنؤ میں ہمیشہ ہوٹل گلمرگ میں ٹھہرا کرتے ہیں۔

دوسرے روز ۹ بجے کی ٹرین سے مجواں جانے والے تھے گاؤں کی سڑک بنوانے کے سلسلے میں چیف منسٹر اتر پردیش رام نریش یادو سے صبح سات بجے ملنے گئے واپسی میں اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ پیر پھسل گیا اور گر پڑے بائیں پیر کے چڈھے کی ہڈی تین ٹکڑے ہو گئی اٹھ نہیں سکے لوگوں نے پکڑ کر بڑی مشکل سے اٹھایا اور کرسی پر بٹھا دیا ظاہر ہے تکلیف کتنی ہوئی ہوگی لیکن ظاہر نہیں کیا اور ہنستے رہے شعر سناتے رہے

لیکن جب تکلیف ناقابلِ برداشت ہوگئی تو چہرے پر پسینہ آنے لگا اور چپ ہو گئے۔
بشن کپور (بلٹز کے یو پی کے نامہ نگار) پہلے ہی پاگلوں کی طرح بھاگ کر میڈیکل کالج پہنچ چکے تھے وہاں سے ڈاکٹر گوئل کو آپریشن تھیٹر سے پکڑ کر لائے کیفی فوراً میڈیکل کالج پہنچائے گئے ایکسرے ہوا معلوم ہوا کہ ران میں تین جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے مجھے فون کیا گیا میں گھبرا کر بائی ائر دہلی پہنچی اور وہاں سے مہدی کو لے کر لکھنؤ پہنچی دیکھتی کیا ہوں کہ پیٹ بری طرح پھول گیا ہے ناک اور منہ سے نلکیاں لگی ہوئی ہیں میں رونے لگی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ پیٹ میں ہیمرج ہو گیا ہے۔ آنتوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے اگر پیٹ اسی طرح رہا تو ایک گھنٹے کے بعد آپریشن کرنا ہوگا میری آواز سن کر ہوش میں آ گئے شاید میرے پہنچنے سے طاقت ملی ہو گی آنتوں آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

تین چار روز کے بعد ڈاکٹر گوئل نے تھوڑی سی دیر بے ہوش کر کے بالکل ماہر فن کی طرح بغیر آپریشن کے ہڈی جوڑ دی اور پیر کو ٹریکشن میں رکھ دیا۔
ساڑھے چار مہینے کیفی کا بایاں پیر بندھا رہا نہ کروٹ لے سکتے اور نہ بیٹھ سکتے۔
ساڑھے چار مہینے تک ایک آدمی چت لیٹا رہا بڑی ہمت کی بات تھی میں وہیں ہاسپٹل میں رہ گئی تھی کیونکہ مہدی نے کہا تھا کہ لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے ڈاکٹر بمبئی سے بہتر ہیں اور یہی ہوا میں نے وہاں چار مہینے رہ کر دیکھا کہ ڈاکٹر گوئل تو خیر انتہائی ذہین اور فرشتہ صفت انسان ہیں لیکن ان کا پورا اسٹاف ڈاکٹر، نرسیں فیوزو تھیوریسٹ غیر معمولی لوگ ہیں کیفی کے اچھا ہونے میں ان سب کا ہاتھ ہے لیکن کیفی بھی عجیب و غریب انسان ہیں اسی ٹریکشن کی حالت میں جب لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا اور نرسیں آکر بتاتیں تھیں کہ آج اتنے شیعہ لڑکے مارے گئے اور آج اتنے سنی تو اسی حالت میں لیٹے لیٹے انہوں نے ایک نظم کہی "لکھنؤ تو نہیں"

لکھنؤ تو نہیں

عزا میں بہتے تھے آنسو یہاں لہو تو نہیں
یہ کوئی اور جگہ ہے یہ لکھنؤ تو نہیں

یہاں تو چلتی ہیں چھریاں زبان سے پہلے
یہ میر انیس کی آتش کی گفتگو تو نہیں

چمک رہا ہے جو دامن پہ دونوں فرقوں کے
بغور دیکھو یہ اسلام کا لہو تو نہیں

تم اس کا رکھ لو کوئی اور نام موزوں سا
کیا ہے خون سے جو تم نے وہ وضو تو نہیں

سمجھ کے مال مرا جسکو تم نے لوٹا ہے
پڑوسیو وہ تمہاری ہی آبرو تو نہیں

یہ نظم فوراً "قومی آواز" میں چھپی کیفی کی اس ساڑھے چار مہینے کی تکلیف میں میں نے ایک دن بھی ان کو غصہ کرتے یا چڑھتے نہیں دیکھا البتہ جب صبح ہوتی تھی تو سب سے پہلا جملہ کیفی کی زبان سے نکلتا "موتی آج ایک دن اور پورا ہوا خدا کا شکر ہے" اور کبھی کہتے "میں ساگر (میرے بھانجے ارشاد احسن کا دوسالہ بچہ جسکو کیفی بے انتہا چاہتے ہیں) کا ہاتھی کبھی نہیں بن سکوں گا"

لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ عرصہ بھی گذر گیا اور کیفی کی قوت ارادی ڈاکٹروں کی محنت اور لگن نے انہیں پھر سے چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا ۔

INDIAN PEOPLES- THEATER یعنی اپٹا کے پریزیڈنٹ ہیں ہر میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ممبر بناتے ہر ڈراموں کے ترجمے کرواتے ہیں خود ڈرامے لکھتے ہیں "آخری شمع" ڈرامہ کیفی کا لکھا ہے جو فرحت اللہ بیگ کے "دلی کے آخری یادگار مشاعرے" سے اخذ کیا گیا ہے ۔ آج کل "زہر عشق" کو منظوم

ڈرامے کی شکل میں لکھ رہے ہیں جو بہت ہی دلچسپ ہے۔ شاعری کرتے ہیں فلموں کے گانے لکھتے ہیں غرض کہ کوئی ایسا کام نہیں جو وہ نہ کرتے ہوں، برسوں بعد ترقی پسند مصنفین کی میٹنگیں پھر سے شروع کرائیں ہیں ابھی تک تو یہ میٹنگیں ہمارے گھر پر ہی ہوتی ہیں۔ میٹنگوں کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں ہیں ۱۹۴۷ء میں یہ میٹنگیں سجاد ظہیر کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ کوئی پرچہ بھی نکالنا چاہتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر نے مجھسے کہا کہ فالج کے بعد ہم نے کسی مریض کو کام کرتے نہیں دیکھا۔ کیفی کو ۱۹۷۳ء میں پدم شری کا خطاب بھی ملا اپنے انتخاب "آوارہ سجدے" کیلئے تین ایوارڈ لئے۔ جس کے بارے میں میں پہلے لکھ چکی ہوں اور بدقسمتی دیکھئے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے اس کتاب کے چھپنے پر پابندی لگادی۔ بعض لوگوں کو ضد ہے کہ اس میں سے "پیر تسمہ پا" نظم نکال دی جائے اور اور کیفی کو ضد ہے کہ وہ اس نظم کے بغیر ہرگز کوئی کتاب نہیں چھاپیں گے غرض کہ ایک اچھی کتاب جو ان کا انتخاب ہے لوگ اسے پڑھنے سے محروم رہ گئے مجھے کبھی کبھی بہت دکھ ہوتا ہے۔

بے حد حساس ہیں اگر کچھ خریدنا بھی ہوتا ہے تو کوشش کرتے ہیں کہ کوئی گانا مل جائے اور پیسے مل جائیں تو وہ کام کریں۔

کبھی کبھی شبانہ چڑھ کر کہتی ہے "ابا اگر یہی پیسے بابا (میرا بیٹا جو شبانہ سے چھوٹا ہے) کماتا تو آپ ہرگز اتنا پرہیز نہ کرتے" تو ہنس کر جواب دیتے ہیں "نہیں بیٹے انسان کو اس وقت تک اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہئے جب تک اس کی طاقت ساتھ دے"

ان کی پلیٹ میں کھانا ڈالنے سے لیکر کپڑوں کا خریدنا سلوانا یہ ہمیشہ سے میرا کام رہا ہے اور آج تک ہے۔ ایک بار کیفی نے شکایت کی کہ پاجامہ تھوڑا چھوٹا ہوتا ہے۔ پہننے میں پھنستا ہے۔ میں نے درزی سے شکایت کی تو وہ ہنس کر بولا "اگر ہم آپ کے سیٹھ کو دیکھے گا تو صحیح ناپ لے گا سیٹھ کو تو ہم نے دیکھا بھی نہیں تو

کپڑا کیسے برابر ہوگا" یہ تو حالت ہے پھر ایک دن پکڑ کر درزی کے پاس لے گئی۔
بیماری کے بعد کچھ زیادہ چپ سے ہو گئے ہیں کبھی کبھی ڈپریشن بھی آجاتا ہے۔
لکڑی پکڑ کر چلنے سے انتہائی نفرت کرتے ہیں لیکن مجبوری ہے لکڑی پکڑنی ہی پڑتی ہے چلتے ہوئے اگر کسی نے ذرا سی بھی مدد کرنی چاہی تو بری طرح چڑھ جاتے ہیں کسی کی مدد قبول کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔

کبھی کبھی بہت دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہیں "کیا میں اپنا دوسرا ہاتھ کبھی بھی استعمال نہیں کر سکوں گا" میں بچوں کی طرح سمجھانے لگتی ہوں "ایک رات جب آپ سو کر اٹھیں گے تو حیران رہ جائیں گے کیونکہ آپ کا دوسرا ہاتھ بھی کام کرنے لگے گا اور فیوز و تھریپی سے جان مت چھڑاؤ اسے روز کرتے رہو خدا میں بڑی طاقت ہے وہ کوئی بھی معجزہ کر سکتا ہے اور جب تک میرا بایاں ہاتھ آپ کا ہی تو ہے"

کتابیں خریدنا ماؤنٹ بلانٹ فونٹن پن تحفے میں قبول کرنا اور پھول پودے لگوانا ان کی دلچسپ ہابی ہے اپنے مالی کو بہت پیار کرتے ہیں اور وہ بھی ان کو بہت چاہتا ہے۔

مرغوب غذا گوشت ہے اچھا پکا ہوا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں میں نے ایک بڑا فلیٹ سمندر کے کنارے خرید لیا ہے بہت خوبصورت اور پر فضا جگہ ہے لیکن کیفی ہرگز وہاں رہنے پر تیار نہیں ہوتے کہتے ہیں میں کسان ہوں مجھے زمین سے پیار ہے یہ پھول اور پودے تو مجھے زندہ رکھتے ہیں۔

صبح کی چاء ہم اپنے چھوٹے سے لان میں بیٹھکر پیتے ہیں وہ اخبار پڑھتے رہتے ہیں اور میں گذرے ہوئے دن کا حساب نوکرسے لیتی رہتی ہوں اسی ماحول سے متاثر ہو کر کیفی نے ایک پیاری سی نظم کہی ہے "ایک لمحہ"

ایک لمحہ

زندگی نام ہے کچھ لمحوں کا
اور ان میں بھی وہی اک لمحہ

جس میں دو بولتی آنکھیں
چائے کی پیالی سے جب اٹھیں
تو دل میں ڈوبیں
ڈوب کر دل سے کہیں
آج تم کچھ نہ کہو
آج میں کچھ نہ کہوں
بس یونہی بیٹھے رہیں
ہاتھ میں ہاتھ لئے
غم کی سوغات لئے
گرمیٔ جذبات لئے
کون جانے کہ اسی لمحے میں
دور پربت پہ کہیں برف پگھلنے ہی لگے

شبانہ اعظمی

کیفی اعظمی میرے ابّا

مجھ پر اکثر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ میں اپنے ابا سے جنون کی حد تک متاثر ہوں۔ میں اپنے دوستوں کو ان کی اپنی ذاتی خوبیوں اور ان کی اپنی انفرادی شخصیت کی بنا پر دیکھنے کی بجائے اُن کا موازنہ اپنے ابا سے کرتی ہوں۔

اس قسم کی باتیں سن کر جو میرا ردِعمل ہوتا ہے اس کا انحصار میری ذاتی ذہنی کیفیت کے مطابق ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ سب سن کر میں اسے ہنسی میں ٹال دیتی ہوں کبھی دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوں اور کبھی کبھی بے حد غصہ بھی آتا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس پہلو پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا۔

لیکن آج جب میں ابا کے بارے میں یہ مضمون لکھنے بیٹھی ہوں تو واقعی سوچ رہی ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں عام بچّوں کے مقابلے میں اپنے ابا سے بہت زیادہ پیار کرتی ہوں۔ کیا میں ابا کو اپنے بھائی بابا سے زیادہ تو نہیں چاہتی ہوں؟۔ یہ سب کچھ بچکانا سا لگتا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ابا میری نظروں میں ایک بہت ہی خاص آدمی ہیں۔ اور میرے لئے وہ سب سے زیادہ چہیتے انسان ہیں۔

یہ بات میں نے اپنے بچپن میں ہی محسوس کرلی تھی کہ میرے ابّا دوسرے "ڈیڈیوں" سے بالکل الگ قسم کے انسان ہیں۔ وہ اُن کی طرح صبح اُٹھ کر "دفتر" نہیں جاتے اور نہ ہی دوسرے بچّوں کے معزّز "پاپاؤں" کی طرح قمیص اور پتلون ہی پہنتے ہیں اور نہ ہی ان کی طرح انگریزی بولتے ہیں۔ اپنی کلاس کے دوسرے بچّوں کی طرح میں اپنے ابّا کو ڈیڈی کہہ کر مخاطب نہیں کرتی اور یہ لفظ 'ابّا' کانوں میں کچھ عجیب سا کانی کھُردرا، کھُردرا سا لگتا تھا۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے میں اپنی چوتھی اور پانچویں کلاس کی سہیلیوں میں اپنے آپ کو دل ہی دل میں کچھ "ذات باہر" محسوس کرتی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ بہت جلد ہی سیکھ لیا کہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے بات چیت کرتے وقت "ابّا" کا ذکر کرنا ہی گول کر دوں۔ اگر کوئی پوچھتا کہ "ابا" کیا کرتے ہیں۔ تو میرا گول مول جواب ہوتا تھا "بزنس"۔ یہ تو میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ میں اس بات کا اعتراف کروں کہ میرے ابّا "شاعر" ہیں یعنی دوسرے لفظوں میں کہوں کہ وہ ایک بے کار قسم کے انسان ہیں اور کوئی کام دام نہیں کرتے۔ لیکن پھر ایک دن ایک معجزہ ہوا۔

میری ایک ہم جماعت لڑکی نے کہا کہ اُس کے "ڈیڈی" نے میرے ڈیڈی کا نام اخبار میں پڑھا ہے۔ اخبار والوں نے میرے ڈیڈی کی ایک نظم کی بہت تعریف کی ہے۔ اس انکشاف نے مجھے فوراً اپنے ابّا کا قائل کر دیا۔ اور میں نے فوراً اپنے "ابّا" کو "ابّا" تسلیم کرلیا..... وہ بھی کرتے پاجامے کے ساتھ۔ واقعی میرے ابّا دوسروں سے بالکل مختلف اور خاص الخاص انسان ہیں۔ "ہے کوئی اور بچہ میری کلاس میں جس کے ڈیڈی کا نام اخبار میں چھپا ہو.....؟"

پھر بھی اُن کی شاعری کیا ہے۔ وہ کیا لکھتے ہیں اس کی سوجھ بوجھ مجھ میں بہت دیر سے آئی۔ جب میں نے KEATS اور WORDSWORTH کی نظمیں اسکول میں پڑھیں تب میری سمجھ میں آنے لگا کہ شاعری کیا ہوتی ہے اور شاعر کسے کہتے ہیں۔ میرے ابّا بھی "شاعر" ہیں، یہ جان کر مجھے اچھا لگنے لگا اور میں گھر کی اُن محفلوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگی جس میں فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی جیسے ممتاز شاعر شرکت کرتے تھے۔ میں ہمہ تن گوش اُن کے وہ شعر سنتی جو میری سمجھ میں قطعاً نہیں آتے تھے۔ لیکن اُن کے لفظوں کی ترتیب اور خوبصورتی اور موسیقیت کانوں میں رس سا گھول دیتی تھی۔

www.taemeernews.com

یہ سارا ماحول میرے لئے بے حد پُرکشش تھا۔ ادبی گفتگو کی روانی ۔ گلاسوں کی کھنک اور سگریٹ کا مرغولے کھاتا ہوا دُھواں ۔ پورے کمرے میں پھیل جاتا تھا ۔ میں نے مشاعروں میں بھی جانا شروع کر دیا ۔ ساحر لدھیانوی بے حد ہر دل عزیز تھے اور سردار جعفری کا لوگوں کے دلوں میں بے حد احترام تھا ۔ لیکن کیفی اعظمی کا اپنا ایک ہی جادو تھا ۔ وہ مشاعرے کے آخری چند شعرا میں ہوتے ۔ اور اپنی گہری اور پاٹ دار آواز اور ادائیگی کے حسن اور قوت سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے ۔ انھیں مشاعروں میں میں نے کیفی کی نظم "ابن مریم" سنی جو میری پسندیدہ نظم بن گئی ... اور پھر اور نظمیں "عادت"، "دائرہ" وغیرہ ۔ ایک باپ کی حیثیت سے ابا کا اثر شاید مجھ پر وہی ہوگا جو کسی بھی باپ کا اپنی اولاد پر ہوتا ہے ۔ لیکن اُن کی شاعری نے ہر بار مجھے ایک نئے سرے سے مرعوب کیا ہے ۔

مجھے قطعاً اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں ابا کی شاعری کو پوری طرح سمجھتی ہوں لیکن اُن کی شاعری کے جن پہلوؤں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا ہے ۔ وہ ہے ان کی زبان کی قوت نظر کی گہرائی اور وسعت اور ان کے استعاروں کی فکر انگیزی ۔ اُن کی شاعری میں کیفی کے ذاتی غم اور مسرتیں ان کی ذاتی وارداتیں نہیں رہتیں ۔ بلکہ تمام انسانوں کے دُکھ اور درد اُن میں سمٹ آتے ہیں ۔ اور اس طرح غم جاناں غم دوراں میں بدل جاتا ہے ۔ اُن کی جدّوجہد عوامی جدّوجہد کا سیل رواں بن جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں جھونپڑپٹی کے لوگوں میں کام کر رہی ہوتی ہوں یا عورتوں پر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتی ہوں یا پھر فرقہ پرستی کے خلاف جدّوجہد میں حصّہ لیتی ہوں تو ابا کی کوئی نہ کوئی نظم اس وقت میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے قوت بخشتی ہے ۔ "مکان" "عورت" اور "بہروپنی" وہ نظمیں ہیں جو میری جدّوجہد کے ہر موڑ پر ہمیشہ میرا سرمایۂ قوت بنتی ہے ۔

مجھے اپنی کم عمری کے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہیں جب میں اپنی اس حماقت پر فخر کرتی تھی کہ میں اخبار نہیں پڑھتی ۔ گھر میں ہونے والی سیاسی بحثوں سے بے حد بور ہو جاتی تھی اور جب مدن پورہ اور دوسرے مزدور علاقوں سے محنت کش لوگ ابا سے ملنے آتے تھے ۔ تو میں جان بچا کر بھاگ جایا کرتی تھی ۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے اس سطحی اور نک چڑھے پن کے رویے

www.taemeernews.com

سے ابّا دل برداشتہ کیوں نہیں ہوئے۔ آخر میں اُن کی بیٹی تھی اور وہ مجھے بچپن میں اپنے ساتھ مدن پورہ میں ہونے والے بہت سے مزدوروں کے جلسے میں لے جا چکے تھے۔ وہ مزدوروں میں خود بھی کام کرتے تھے۔ یقیناً ان کی یہ خواہش ہوگی کہ میں مزدوروں اور اُن کے مسائل میں دلچسپی لوں۔ اور ایک طرف میں تھی کہ ان لوگوں سے کترا رہی تھی۔ دراصل کانوینٹ کی تعلیم نے مجھ میں ایک طرح کی بے رُخی اور بے اعتنائی پیدا کر دی تھی جو مجھے ایسی تمام باتوں سے دور لے گئی تھی۔ لیکن ابّا نے ایک بار بھی میرے اس رویّے پر غصّے کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ ہی کبھی انھوں نے اپنے خیالات مجھ پر لادنے کی کوشش کی (سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی معمولی سے معمولی مسئلے پر بھی بن مانگے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ اُن کی رائے چاہیئے تو مانگنی پڑے گی۔ اس معاملے میں اُن کا رویّہ مجھ سے اور ممّی سے بالکل الگ ہے۔ کیوں کہ ہم دونوں پوری دنیا کو مانگے بن مانگے اپنی ذرّیں رائے دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔)

آج سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شاید وہ جانتے تھے کہ اُگتا ہوا پودا لاکھ سوچے کہ وہ اپنی جڑوں سے دور ہو رہا ہے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ خاک کہیں بھی اُڑی اڑی پھرے پہنچتی وہیں ہے جہاں کا خمیر ہوتا ہے۔ سو وقت کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ میں صبح کی بھولی شام سے تھوڑے پہلے ہی گھر آ گئی۔ اور اس گھر سے میرا مطلب اپنے ابّا کی سیاسی اور سماجی سوچ سے ہے۔

آج کل جب میں کبھی کبھی اس بات سے مایوس ہو جاتی ہوں کہ حالات کو جس تیزی سے بدلنا چاہیئے بدل نہیں رہے۔ جھونپڑ پٹی والوں کی جدّوجہد کو مفاد پرست عناصر کامیاب ہونے سے روکے ہوئے ہیں۔ غریب عورتوں کے مسائل آج بھی وہی ہیں۔ فرقہ پرستی کا عفریت آج بھی شہروں کی سڑکوں پر ناچ رہا ہے۔ ایسے بھی لمحے آتے ہیں جب امّید کمزور ہو جاتی ہے۔ ایسے لمحوں میں میری ماں مجھے کیفی صاحب کی ان کوششوں کی یاد دلاتی ہیں جو وہ اپنی اس صحت کے باوجود اپنے گاؤں کی خاطر کر رہے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں میں اُن کی انتھک کوششوں کی وجہ سے اب اس چھوٹے سے گاؤں میں سڑک ہے۔ بجلی ہے۔ ایک چھوٹا سا چھ بستروں والا اسپتال ہے ایک اسکول ہے۔ پوسٹ آفس ہے۔ اور یہ سب حاصل کرنا ایک چھوٹے سے گاؤں کے لئے آسان نہیں تھا۔ ایک ایک قدم پر انھیں مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ (سرکار اور سرکاری

www.taemeernews.com

افسروں سے کوئی کام کروالینا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا کہ جوئے شیر لانا) اگر اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار بیٹھتا۔ لیکن ابا میں لوگوں کو منظم کرنے اور اُن کی رہنمائی کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ جب ۱۹۷۲ء میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا تو ہم میں سے کوئی بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ ابا اپنی جدّوجہد جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن ڈاکٹروں نے ہمیں وارننگ دی کہ ہم ابا کو کسی کام سے نہ روکیں کیونکہ وہ اپنی قوّت ارادی اور زندگی سے بے پناہ محبت کے بل بوتے پر ہی اپنی بیماری پر قابو پا سکتے ہیں۔ وہ آج مفلوج ہونے کے باوجود مفلوج نہیں ہیں۔ میں کیفی صاحب کی قوت ارادی ان کے عمل اور ان کے ناقابلِ تسخیر جذبے کو سلام کرتی ہوں۔
سردار جعفری جو ہمارے خاندان کے گہرے دوست ہیں اور ابا کو اپنا چھوٹا بھائی مانتے ہیں مذاق میں کہا کرتے ہیں "کیفی نے فالج کے ساتھ اتنی زیادتی کی ہے کہ وہ اب ڈر کر کسی دوسرے شاعر پر نازل نہیں ہو سکتی۔"

ابا ان دنوں بمبئی میں نہیں رہتے۔ بمبئی میں وہ خود کو اکیلا محسوس کرتے ہیں۔ اگر انھیں دس دن بھی بمبئی میں رہنا پڑ جائے تو اُکھڑے اُکھڑے سے لگنے لگتے ہیں۔ میری اور میرے بھائی بابا کی خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ہمارے ساتھ رہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُن کا دل مجواں میں لگا رہتا ہے۔ جب وہ ہمارے پاس نہیں ہوتے تو میں ان کی کمی محسوس کرتی ہوں (ابا اگر بمبئی میں ہوتے ہیں اور میں کہیں باہر ملک سے واپس آتی ہوں تو وہ مجھے ہوائی اڈے پر لینے ضرور آتے ہیں۔ چاہے کوئی بھی وقت ہو۔ ہوائی اڈے کے گرین چینل سے نکلتے وقت اُن کا چہرہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ اور اُن کو دیکھ کر میرا دل کھل اُٹھتا ہے۔
میں اور ابا بہت کھل کر بات نہیں کرتے۔ یوں تو میں امّی سے زیادہ قریب ہوں لیکن جب میرا ذہن صاف نہیں ہوتا اور مجھے کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو پھر میں ابا ہی سے پوچھتی ہوں انھیں سے رائے لیتی ہوں۔ زندگی میں بڑے سے بڑے سنگین مرحلے پر ابا ہی میری رہنمائی کرتے ہیں معاملہ کتنا ہی گمبھیر کیوں نہ ہو۔ ابا بڑی مدبّری سے کام لیتے ہیں۔ وہ جذبات کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ معاملے کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر وہ اپنی رائے دیتے ہیں۔ جب فرقہ وارانہ یکجہتی کے سلسلے میں میں دہلی سے میرٹھ تک پدیاترا (پیدل چلنے) میں شامل ہونے کی تیاری

www.taemeernews.com

کر رہی تھی تو میں بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ مجھے وارننگ دے دی گئی تھی کہ حالات پُرتشدّد ہوسکتے ہیں اور کسی فلمی ایکٹریس کے لئے ان حالات میں میرٹھ جیسے کسی بھی شہر میں اس طرح جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ جب میں سب کو خدا حافظ کہہ رہی تھی تو جاوید اور میرے بھائی بابا۔ بھابھی تنوی اور میری ماں یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ میرے لئے پریشان نہیں ہیں۔ مگر میں دیکھ سکتی تھی کہ وہ سب اندر سے میرے لئے فکرمند ہیں۔ اور اسی بات نے ایک لمحے کو مجھے بھی خائف سا کر دیا۔ میں آگے بڑھی اور میں نے ابا کو پیٹھ کی طرف سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میں نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو بہنے سے روکے رکھا۔ ابا نے مجھے کھینچ کر اپنے سامنے کر لیا اور میری آنکھوں میں بڑی حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا "میری بہادر بیٹی ڈر رہی ہے؟ جاؤ تمھیں کچھ نہیں ہوگا" ان کی آنکھوں میں کہیں میرے لئے خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اُن کی بے خوف آنکھیں دیکھ کر یکایک مجھے اپنے اندر ایک بے پناہ قوّت کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اُن کی آنکھوں سے ایک طاقت تیرتی ہوئی مجھ تک آئی ہے اور میری پوری ذات میں پھیل گئی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دہلی سے میرٹھ کی وہ پد یاترا بے حد کامیاب رہی۔ راستے میں ہر گاؤں ہر بستی کے لوگوں نے ہمارے جلوس کا خیر مقدم کیا۔ ہم نے ان سے باتیں کیں اور کئی جگہ میں نے مجمع کو فرقہ واریت کے خلاف ابا کی نظم "بہروپنی" بھی سنائی۔ اور ہر بار نظم سناتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ صرف آواز میری ہے ورنہ ابا ہی ان لوگوں کو خطاب کر رہے ہیں۔

جب بھی میں نے ابا کی رہنمائی پر بھروسہ کیا مجھے کامیابی ملی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک میرے سر پر ابا کا ہاتھ ہے اور جب تک اُن کے شعور کا سرمایہ میرے پاس ہے۔ زندگی کے دشوار سے دشوار موڑ پر بھی مجھے کبھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

***